ناولٹ

"احتیاج اور خواہش میں فرق ہوتا ہے۔ اس لیے بعض مرتبہ احتیاج پوری بھی ہو جائے تب بھی خواہش پیاسی رہ جاتی ہے۔۔۔ حتیٰ کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ایک ناگزیر ضرورت بن کر رہ جاتی ہے۔ کیا تم نے کبھی ایسا محسوس کیا فرزان!"

ولید اپنے مخصوص فلسفیانہ لہجے میں مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ آج پھر بقول عمر اس پر خلیل جبران کی روح کا سایہ ہوا تھا۔

مجھے جواب دینا تھا اور میں ابھی اس کے فلسفے کو ہی

"کیوں۔ یوں سمجھو تمہیں پیاس لگ رہی ہے اور تشنگی بجھانے کے لیے تمہیں پانی دیا جاتا ہے۔ سادہ میٹھا پانی جبکہ تمہیں خواہش کسی اور مشروب کی ہے۔ پھر کیا کرو گے تم تمہارا ردعمل کیا ہو گا۔"

وضاحت ایک بار پھر سوال میں ڈھل گئی تھی۔ عمر حسب عادت قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں شرارت ہی شرارت تھی۔

"ظاہر ہے کیا ہے۔ پہلے پانی سے پیاس بجھائیں گے۔ پھر نکل پڑیں گے مشروب کی تلاش میں۔"

افشاں آفریدی

بن مانگے موتی ملیں

سمجھنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ عجیب عجیب استفسار ہوتے تھے اس کے بھی جو کبھی سمجھ میں آجاتے اور کبھی حرف نامعتبر کی طرح سر سے گزر جاتے۔

"کیا مطلب؟ اس نامعقول سوال سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

عمر سے میرا خاموش رہنا برداشت نہ ہوا تو ہمیشہ کی طرح ولید کی طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے شوخی سے دریافت کیا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ولید جھنجلا جاتا مگر وہ بھی جانے کس ٹھنڈی مٹی سے بنا تھا ذرا جو ماتھے پر کوئی شکن پڑی ہو۔ بہت اطمینان سے اس کی طرف رخ پھیرتے ہوئے بولا۔

"بہت واضح بات ہے عمر۔ اس کی مزید تشریح کیا

ایک آنکھ میچتے ہوئے وہ قصداً "عامیانہ" تاثر دیتے ہوئے بولا تھا۔ مگر ولید کی فلسفیانہ آنکھوں میں ناگواری کی کوئی تحریر رقم نہ ہوئی وہ اسی تسلسل اسی حکمت سے بولا۔

"کیوں! آخر کیوں تلاش کرو گے تم دوسرا مشروب جبکہ تمہاری پیاس تمہاری تشنگی سادہ پانی سے دور ہو چکی ہے۔ تمہیں پیاس نہیں تو کیوں چاہیے تمہیں تمہارا من پسند مشروب کیوں نہیں تم قناعت کر لیتے اس پر جو تمہیں مل چکا ہے۔"

ولید کے ٹھنڈے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کیے گئے سوالات خاصے وزن دار تھے میں نے عمر کے لاجواب ہو جانے پر بے ساختہ اسے دیکھا تھا۔ جبکہ وہ مبہم مسکراہٹ لبوں تلے دبائے ہوئے سر کھجا رہا تھا۔

ہم دونوں خاموش رہے تو ولید نے ہی سلسلۂ کلام جوڑا۔

"بس یہی فرق ہے احتیاج اور خواہش میں۔ احتیاج پوری ہو جائے تو بھی خواہش سے دامن چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے اور یہی تمنا بس یہی خواہش حسرت ناتمام بن کر زندگی کا سکون اور دل کی خوشی چھین لیتی ہے۔"

اپنے سدا کے لاپرواہ انداز اور حکیمانہ لہجے میں اس نے ساری بحث کا نچوڑ لا کر ہمارے سامنے دھر دیا تھا۔

"کیوں فرزان! تم متفق ہو مجھ سے؟"

معاً اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو میں مبہم سا مسکرا دیا۔

"معلوم نہیں۔ شاید اس لیے کہ میں نے آج تک احتیاج اور خواہش کے فرق کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور شاید اس لیے بھی کہ میری ہر ضرورت اور ہر تمنا ہمیشہ پوری ہوتی رہی ہے۔ البتہ تمہارے فلسفے سے مجھے انکار نہیں۔ تاہم میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ تم صد فیصد درست ہو۔ کیونکہ زندگی ہر ایک کے لیے مختلف سانچے میں ڈھلتی ہے جبکہ میں زندگی کے لیے ایک ایسا تور بنانا چاہتا ہوں جو اسے خود تراشے۔"

میں نے متوازن لہجے میں کہتے ہوئے گفتگو کو سمیٹنے کی کوشش کی۔

"لو ہو گئی چھٹی۔ یک نہ شد دو شد۔ ارے بھائی آخر مجھ پر کیوں ظلم ڈھاتے ہو تم دونوں۔ لاحول ولا قوت تم دونوں کے ساتھ بیٹھ کر تو زندگی الجبرا کا پیچیدہ اور لاینحل سوال لگنے لگتی ہے۔ اتنا گنجلک تو فیثا غورث کا تھیورم بھی نہیں لگتا تھا مجھے۔"

عمر نے بڑی دیر بعد دہائی دی تھی۔ میں سر جھکا کر مسکرا دیا جبکہ ولید ویسا ہی سنجیدہ تھا۔

"زندگی مشکل اور دشوار نہیں لگتی ہے عمر! ہم اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ تم جیسے انسان محض زندگی گزارتے ہوئے سمجھتے نہیں اسے پرکھتے نہیں۔"

"فائدہ بھی کیا خوامخواہ کی دماغ سوزی اور دیدہ ریزی کا۔ جو ہے سو ہے نہ تم بدل سکتے نہ تمہارے جیسے اسکول آف تھاٹ سے تعلق رکھنے والے تبدیل کر سکتے زندگی کے اس مزاج کو۔ سو بہتر یہی ہے کہ زندگی کو جیا جائے نہ کہ کڑوا گھونٹ سمجھ کر پیا جائے۔ وہ کیا خوب کہا ہے کسی نے کہ۔

بہتر یہی ہے زیست کو ہنس کر گزار دو
محسوس کرو گے تو مسلسل عذاب ہے

"لہٰذا میرے یار من! مجھ پر رحم کرو۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے چل کر کچھ پیٹ پوجا کا انتظام کرو۔ کیا تمہارے جیسے فلسفی محض لفظ چباتے اور افکار نگلتے تھے۔"

عمر سنجیدگی سے بولتے بولتے پھر پٹری بدل گیا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اس پر ترس کھا کر اٹھ گئے۔

اور پھر سموسے اور کولڈ ڈرنک سے شغل کرتے ہوئے عمر نے مسلسل ولید کا ریکارڈ لگایا اور ساتھ ہی مجھے بھی خوب کوسا۔ کیونکہ میرے ہی کہنے پر آج ہم یونیورسٹی آئے تھے۔

سمسٹر کا رزلٹ ابھی اناؤنس نہیں ہوا تھا اور میں گھر میں پڑا پڑا حد سے سوا بوریت برداشت کر رہا تھا۔ لہٰذا ان دونوں کو میں نے ہی یہ مشورہ دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں عمر نے میری جیب خالی کروا ڈالی تھی۔ کیونکہ بقول اس کے اس قدر خشک فلسفہ ہضم کرنے میں اس کی جتنی طاقت ضائع ہو چکی تھی اسے اسی طرح بحال کیا جا سکتا تھا۔

میں نے محسوس کیا ولید کچھ اپ سیٹ ہے مگر عمر کی موجودگی میں کچھ بھی پوچھنا عبث تھا۔ وہ ایک بار پھر ولید کے گلے پڑ جاتا اور ساری گفتگو کا تانا بانا بکھیر کر رکھ دیتا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ شام کو ولید سے مل کر ہی پوچھوں گا۔

یہ خیال اس قدر حاوی رہا کہ میرا دل یکدم اچاٹ ہو گیا۔ عمر نے محسوس کیا تو بل لے کر کے فوراً واپسی کا

ارادہ باندھ لیا۔ انکار کے تھا میں بھی راضی ہو گیا۔ جبکہ ولید کچھ دیر ہماری کمپنی سے محظوظ ہونا چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ خاموش رہا مگر ہم نے قصداً "پروا نہ کی اور اپنی اپنی بائیک پر ریس لگاتے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف مڑ گئے۔

ولید حسب سابق پیچھے رہ گیا تھا۔ جبکہ عمر مجھ سے آگے نکل جانے کی خوشی میں تمتماتا چہرہ لیے آگے بڑھ گیا تھا۔

*_*_*

میرے محسوسات ولید کے معاملے میں صد فیصد درست تھے۔ وہ اپنے کسی پرسنل پرابلم کی وجہ سے سخت اپ سیٹ تھا۔ گو کہ عمر ولید اور مجھ میں بہت گہری اور پرانی دوستی تھی مگر ذاتیات پر اترنے کی کسی میں خو نہیں تھی۔ کسی نے خود بتا دیا تو ٹھیک ورنہ خاموشی ہی شعار۔

میں بھی کچھ دیر خاموش ہی رہا کیا کہتا سوائے تسلی دینے اور ہمت بڑھانے کے۔

"لیکن ایسا کیوں فرزان۔ آخر انسان کی روح اور وجود دو حصوں میں کیوں بانٹ دیا جاتا ہے۔ کیوں یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ چوٹ اگر وجود کو لگے گی تو اس کا روح پر اثر نہیں ہوگا۔"

ولید بہت کم اس درجے پریشانی کا شکار ہوتا کہ اپنے احساسات یکدم ہی بیان کرنے پر تل جائے اس وقت اسے ایک ایسے ہمدرد سامع کی ضرورت تھی جو اسے سن سکے۔ بھلے سے اس کی مشکل کا کوئی حل نہ دے مگر اسے سنے۔ جس کے سامنے وہ اپنا دل کھول کر رکھ سکے شاید اسی لیے میرے ایک فون پر وہ یونیورسٹی دوڑا چلا آیا تھا۔

حالانکہ وہ جانتا تھا اس کے چہرے سے مترشح تھا کہ اسے یقین ہے میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا مگر ایک سامع کے ہونے کا ایک کندھے پر سر رکھ کر رونے کا آسرا ہی بڑا تھا۔

"میرے گھر والے مجھے ایک ایسے رستے پر چلنے کے لیے مجبور کر رہے ہیں جس پر قدم اٹھا کر میری احتیاج تو پوری ہو جائے گی مگر خواہش ادھوری رہ جائے گی اور میں ایسا نہیں چاہتا۔"

مٹھیاں بھینچتے ہوئے وہ سخت ٹینشن میں نظر آ رہا تھا اس کا منضبط اظہار لہجہ ہنوز تھا مگر لفظوں میں جیسے شعلوں کی لپک تھی۔ مجھے اس کی صبح والی گفتگو یاد آئی تو طویل سانس لی۔

"تو پھر جو تم چاہتے ہو اس کے لیے اپنے گھر والوں کو کنونس کرو۔"

میں نے گہری سانس بھر کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو وہ یکدم ہنس پڑا۔

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ شیشے کی گرد اور ذہنوں کی گرد صاف کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آج جان بھی لیا۔ کیا تمہیں یقین آئے گا فرزان! اگر میں بھی زندگی کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کیا جانے لگا ہوں یہاں مجبور۔"

میری آنکھوں میں یقیناً حیرت در آئی تھی۔ جس پر وہ استہزائیہ سا مسکرا کر بولا۔

"پتا نہیں کیوں معاشی بوجھ معاشرتی زندگی کا ڈھانچہ بدل کر رکھ دیتا ہے۔ آخر انسان کی روحانی موت پر وہ آنسو بہانے والے کیوں زندہ نہ رہے فرزان۔"

ولید ایک بار پھر گم ہونے لگا تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ بات اب سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہی معاشی اور اقتصادی الجھنیں۔

ولید کا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے تھا۔ اس کی آپی کا خواب دیکھتے دیکھتے ہی اس کے بوڑھے والد کی آنکھوں میں اندھیرے اترے تھے۔ جبکہ وہ کتابوں پر علوم پر اور زندگی کے فلسفے پر جان دینے والا ایک آئیڈیلزم کا مارا بندہ تھا۔

اعلیٰ تعلیم ہر علم پر عبور حاصل کرنا اور زندگی کے اصل فلسفے کو کھوج نکالنے کی اس کی شدید خواہش اس کے بھوک اور بیماری سے سسکتے خاندان کو سوائے دکھ کے کچھ نہیں دے سکتی تھی۔ سب کا اصرار تھا کہ وہ تعلیم کو خیرباد کہہ کر اپنے ابا کا جنرل اسٹور سنبھال لے۔

پرچون کی دکان کی آمدنی کو وہ جمع دو چار کرنے کے بجائے پانچ کرنے کی تگ و دو سے زندگی کا حاصل ضرب تقسیم کرے۔ مگر وہ وہ کچھ اور تھا۔ کچھ اور بننا چاہتا تھا۔

"کیا پھوپھی جاب کا مسئلہ؟"

میں نے قصداً سوال ادھورا چھوڑا تو اس نے سر جھٹک دیا۔

"ہونہہ! درحقیقت مجھ سے میرے ہونے کا، میرے وجود کی بقاء کا خراج لیا جاتا ہے اور اس کوشش میں سب یہ بھی بھول گئے ہیں کہ وجود کے اندر ایک ذات بھی ہوتی ہے اور اس کی احتیاج ہی اس کی خواہش ہے۔"

"مگر تمہاری فیملی کو تمہاری مالی سپورٹ کی ضرورت ہے محض لفظوں سے کسی کا پیٹ نہیں بھرا جا سکتا ولید! زندگی عمل کا نام ہے اور عمل ہی سے انسان اپنی ضرورت اور تمنا دونوں کو پوری کرتا ہے۔ سچ مانو تو یہی زندگی ہے۔ جو مل جائے اس پر قناعت کر لو تمہیں زندگی گزارنے کے لیے "سادہ پانی" مل رہا ہے۔ اپنی تشنگی بجھاؤ اور اگر کبھی موقع مل سکے تو اپنی خواہش کا "مشروب" بھی تلاش کر لینا۔"

اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے میں نے اسے بہت محبت اور خلوص سے مشورہ دیا تھا اور جانے میرے لہجے میں ایسا کیا تھا کہ ولید کتنی ہی دیر مجھے دیکھتا رہا اور جب بولا تو اس کی آواز ہی نہیں اس کا لہجہ بھی شکستہ تھا۔

"کہنے اور کرنے میں بہت فاصلہ ہے فرزان! ہزاروں نوری سال کے فاصلے سے بھی زیادہ مسافت۔ جو تم کہہ گئے وہ کرنے میں کتنا خون جلے گا جسم کی ایک ایک رگ سے کتنا لہو بہے گا تم نہیں سمجھ سکتے۔ شاید اس لیے کہ تم نے احتیاج اور خواہش کے فرق کو سمجھنے کی بھی کوشش ہی نہیں کی اور شاید اس لیے بھی کہ تمہاری ہر ضرورت اور ہر تمنا پوری ہوئی ہے۔"

ولید ایک بار پھر اپنے پروقار اور پر تمکنت انداز و اطوار پر لوٹ آیا تھا۔ اس کے لہجے میں ذرا دیر پہلے والی شکستگی نے جو رنگ بھرا تھا۔ وہ اس کے لفظوں کو اور بھی وزن دار بنا رہا تھا۔

میں سوائے کف افسوس ملنے کے کیا کر سکتا تھا اور یوں ہماری دوستی کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ جانے ولید میری صاف گوئی سے خفا ہو گیا تھا یا اسے واقعی مہلت نہ مل سکی کہ وہ ہمیں بتائے بغیر اطلاع دیے ملے بغیر ملک چھوڑ گیا۔

اپنے والد کا جنرل اسٹور بیچ کر اس نے امریکہ کا ٹکٹ حاصل کیا تھا اور وہاں جا کر ڈالرز کمانے کی احتیاج کے پیچھے اپنی علم کمانے کی خواہش منوں مٹی تلے دفن کر گیا تھا۔

*_*_*

ابتدائی دنوں میں مجھے خاصی وقت ہوئی کیونکہ میں طبعاً سنجیدہ ہونے کی بنا پر ولید سے زیادہ قریب تھا اور اس کے اس طرح چلے جانے کو بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ اس کے یوں زندگی سے چلے جانے کو محسوس کر رہا تھا۔ جبکہ عمر بظاہر ویسا ہی تھا۔ اگر اسے ملال تھا بھی تو اس نے اسے اپنی ہنسی میں چھپا لیا تھا۔

فائنل ایئر کی کلاسز شروع ہوئیں تو جلد ہی ہمارا منتشر ہوا ولید کے جانے سے ٹوٹ گیا تھا۔ شاز ناصر کی بدولت ایک بار پھر مکمل ہو گیا۔ اس سے ہمارا ملنا بھی ایک اتفاق تھا۔

اس روز میں اور عمر بہت تیزی سے پارکنگ لاٹ کی طرف اپنی بائیک دوڑاتے ہوئے آ رہے تھے کہ اچانک وہ ہمارے سامنے آ گئی اور یکدم ہمیں اپنے سامنے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے حواس کھو بیٹھی اور جب تک سنبھلی تب تک ہم بریک لگا چکے تھے الٹا اس کی بے ساختہ چیخ بہت سے لوگوں کو متوجہ کر چکی تھی۔ جو کچھ ہاتھ میں تھا وہ گرا چکی تھی۔

"سوری میڈم ہمیں واقعی بے حد افسوس ہے۔"

عمر نے بوکھلائے ہوئے قریب جا کر اس سے معذرت کی۔

"شٹ اپ! یہ کوئی ریسنگ ٹریک سمجھ رکھا ہے آپ نے یہ طریقہ ہوتا ہے ڈرائیو کرنے کا وہ بھی یونیورسٹی کی حدود میں۔"

خلاف توقع وہ بری طرح چلائی تھی میں اور عمر ہکا بکا سے رہ گئے۔ اتنی عزت افزائی ہو گی۔ ہمیں قطعاً اندازہ نہ تھا۔ ہم دونوں اب تک بائیک پر تھے۔

"میں آپ کی شکایت کروں گی۔ اُف انسلٹ ٹوٹلی انسلٹ۔"

زمین پر گرے شولڈر بیگ اور کتابیں اٹھاتے ہوئے وہ سخت برگشتہ تھی اور ہم دونوں ہم بخود۔ بیگ وہ غصے میں سر جھٹکتی مستقل بولے جا رہی تھی۔ بیگ کھول کر دیکھا تو اور بھی غصے میں آ گئی۔

"حد ہو گئی اب تعلیمی اداروں میں بھی اس قسم کی ریش ڈرائیونگ کی جانے لگی ہے۔ میرا کتنا نقصان ہو گیا۔"

"اچھا جی اب بس کریں۔ کیا تحفہ دار تک پہنچا رہی ہیں ملے کہ آپ کا۔"

عمر اتنی دیر میں اچھا خاصا بد اخلاق ہو چکا تھا۔

"بالکل میرا بس چلے تو پھانسی لگوا دوں آپ کو آج ہی پاپا نے مجھے گفٹ کیا تھا اور آپ کی مہربانی سے کرسٹل کا یہ پیس ٹوٹ گیا۔"

شدید غصے اور تاسف سے کہتے ہوئے اس نے کرسٹل کی ٹوٹی ہوئی چند کرچیاں بیگ سے برآمد کیں۔ جانے ٹوٹنے سے پہلے یہ کرچیاں کس شکل میں ڈھلی ہوئی تھیں۔

ہم دونوں بری طرح شرمندہ ہو گئے۔ نقصان تو واقعی ہوا تھا اس کا۔ اتنے میں چند اور اسٹوڈنٹس بھی ہمارے اردگرد جمع ہو گئے تھے اور اس نفیس کرسٹل کی اچھی خاصی نمائش لگ گئی۔

"اوہ وی آر ویری سوری مس! ان فیکٹ ہمیں اصلی اندازہ نہ تھا کہ آپ یوں سامنے آ جائیں گی۔"

مجھے یکدم احساس ہوا کہ ہمیں معذرت ایک بار پھر کرنی چاہیے۔

"کیا مطلب ہے آپ کا کہ میں سامنے آ گئی تھی آپ کی اس ٹریل کے۔ یعنی مجھے شوق ہوا تھا خود کشی کا۔ ایسی ہی بے زار نظر آتی ہوں میں زندگی سے آپ کو۔"

وہ تو وہ بدو لڑنے مرنے پر آمادہ تھی۔ عمر اور میں کچھ ڈھیلے سے پڑ گئے۔ اب اسے کس طرح سمجھائیں کچھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم معاملہ رفع دفع کرنے کے چکر میں تھے اور وہ تھی کہ بگڑے جا رہی تھی۔ اس وقت ایک اہم کلاس اٹینڈ کرنے کی ہی خاطر تو ہم فلائنگ ہارس بنے ہوئے تھے۔

"دیکھیے ہم نے آپ سے معذرت کر لی ہے نا۔ اب آپ بھی اتنا غصہ نہ کریں۔ ہم سب یہاں پڑھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے فیلوز ہیں۔ لہٰذا غلطیاں معاف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ چاہیں تو ہمیں تاج اس ہم فقیر سے پوچھ لیں۔"

عمر اپنے مزاج کے خلاف اس وقت سخت کنٹرول ہو رہا تھا بمشکل خود پر قابو پایا ہوا تھا۔ شاز نے عمر کے اس جملے پر بے ساختہ میری طرف دیکھا تو میں دوستانہ انداز میں مسکرا دیا۔ جس پر موصوفہ کے بگڑے تیور کچھ درست ہو گئے۔

"رہ گئی آپ کے نقصان کی بات تو اس کو پورا کرنے کے لیے ہم تیار ہیں۔" عمر اس کے اس طرح مان جانے پر خوش ہو گیا تھا۔ جب ہی مسکراتے ہوئے بولا۔

"یہ نقصان کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ میری برتھ ڈے کا گفٹ تھا۔ اب آپ اس کرسٹل بیئر کی جگہ سونے کا بنا ہوا بھی لا دیں گے تو وہ میرے پاپا کے گفٹ اور ان کی محبت کے بھی بھی متبادل نہیں ہو سکے گا۔" وہ یکدم متاسف نظر آنے لگی تھی۔

"تو پھر آپ ہی بتائیے کیا کریں۔ فرانس پر اٹیک کر دیں۔ وہاں سے کچھ اور نہیں کرسٹل تو ضرور مل جائیں گے۔"

میں بالارادہ ہی کہہ اٹھا تھا۔ جس پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

"جی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔"

"چلیے یہ بھی اچھا ہے۔ مگر فی الحال ہمیں جلدی ہے۔ ہماری کلاس مس ہو جائے گی۔" میں نے گھڑی

دیکھتے ہوئے شکر کا سانس لیتے ہوئے کہا تو وہ شانے اچکا کر رہ گئی۔

یہ ہماری پہلی ملاقات تھی جس میں شاذ کا پہلا تاثر کچھ خاص نہیں تھا۔ خاص کر میرا اس طرح کی لڑکی سے پہلی بار پالا پڑا تھا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میرا تعلق ایک روایت پرست خاندان سے تھا جہاں غیر ضروری پابندیوں کی بہتات تھی اس پر مستزاد آغا جان اور اماں جان کی اصول پسندی۔ میں نے اسکول اور کالج کے زمانے میں بھی کو ایجوکیشن میں نہیں پڑھا۔ خاندان کی دو قسم کی لڑکیوں سے بھی بات چیت کرنے کا دل چاہا نہ ہی اس کی آزادی تھی۔

کچھ میں فطرتاً لیے دیے رہنے والا شخص تھا اور کچھ آغا جان کی سخت گیری کے باعث میں صرف اپنی ذات تک محدود رہنے کا عادی ہو چلا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ صنف نازک کی اس "قسم" سے میرا شاذ و نادر ہی تعلق رہا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی ولید کی "مہربانی" سے ہمارا گروپ ہمیشہ صنف نازک سے الرجک رہا۔ وہ جس قدر مست ملنگ تھا اسی قدر خواتین سے الرجک بھی۔ خدا جانے کیوں اس کی یہ صفت عمر کو بہت جھلسائی مگر کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا جونہی ولید ہم سے بچھڑا شاذ ناصری ہمارے گروپ کا حصہ بن گئی۔ جس میں عمر کا بھرپور ہاتھ تھا۔ کیونکہ اس روز ساری کلاسز بڑی بے چینی سے اٹینڈ کرنے کے بعد عمر نے تمام وقت اسے ہی کھوجنے میں گزار دیا تھا۔

اب اسے قسمت کی یاوری کہیں یا محض اتفاق کہ شاذ بھی ہمیں ہی تلاش کر رہی تھی اور جوں ہی ہماری ملاقات کامن روم کے باہر ہوئی وہ تیز قدموں اور بشاش چہرے سمیت ہماری طرف چلی آئی۔

"تھینکس گاڈ آپ دونوں مل گئے۔ میں آپ کو ہی ڈھونڈ رہی تھی۔" قریب آتے ہی اس نے روانی اور بے تکلفی سے کہا۔

"خیریت اب کیا تاوان لینے کا خیال آ گیا ہے۔" عمر نے فوراً تشویش کا اظہار کیا تو وہ بے ساختہ ہنس چلی گئی۔

"میں بہت حسن پرست تو نہیں ہوں مگر حقیقتاً" اس وقت مجھے وہ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی لگی۔ وہ سر سے پاؤں تک حسین تھی۔ جبکہ اس کی مسکراہٹ بھی بہت نفیس اور جاذب نظر تھی۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس لمحے میں نے سارا جہاں بھول کر اس کو دیکھا تھا جبکہ وہ کہہ رہی گویا تھی۔

"ارے نہیں۔ ان فیکٹ میرا آج دوسرا دن ہے یونیورسٹی میں۔ میں فائن آرٹس کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ آپ کو صبح سے تلاش کر رہی تھی کہ کچھ مدد حاصل کر سکوں شیڈول کے بارے میں۔"

"آپ فائن آرٹس کی ہیں۔ مگر آپ کہہ رہی ہیں دوسرا دن ہے یونیورسٹی میں۔" مجھے اس کے بیان سے کچھ تسلی نہیں ہوئی تھی لہٰذا پوچھنے میں تردد نہ کیا۔

"اوہ" وہ پھر مسکرائی تھی "دراصل میں نے مائیگریشن کروائی ہے۔ اس لیے صبح کے حادثے کے باعث آپ سے سوچا دوستی کر لیتے ہیں۔ کیا حرج ہے۔"

شولڈر بیگ سے منرل واٹر کی بوتل برآمد کرتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

"ویسے مجھے شاذ ناصری کہتے ہیں۔ میں پروفیشن ایئر ہوسٹس ہوں۔ میرے فادر پہلے ایئر فورس میں تھے ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے کمرشل فلائنگ شروع کر دی۔ ان دنوں ہم فیز فائیو میں رہتے ہیں۔"

ہم اس کے بڑھے ہوئے دوستانہ ہاتھ کو تھامیں گے یا نہیں یہ جانے بغیر وہ کمال اطمینان سے کسی کاریڈور کی طرف آ گئی۔ ہم بھی ساتھ تھے۔

"صرف دونوں؟ کیا مطلب تمہاری مدر نہیں ہیں؟ کہیں ان کی؟" میں ابھی صرف اس کی بے تکلفی پر ہی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا کہ علی نے حاضر دماغی سے سوال بھی کر ڈالا جس پر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

"ارے نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ بھی یہیں کراچی میں ہی رہتی ہیں۔ عرصہ ہوا انہوں نے پاپا سے

طلاق لے لی تھی۔ اس وقت ہی انٹر میں تھی۔ پاپا اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے تو چند سال کے لیے شہر ہی بدل دیا۔ مگر بہرحال اب تو وہ بھی ریٹائرمنٹ کے بعد واپس آ گئے ہیں۔"

اپنی زندگی کا اس قدر حساس پہلو وہ پہلے ہی دن ہم پر آشکار کر گئی تھی اور یہ سب کہتے ہوئے اس کی نظریں جھکی ہوئی نہیں تھیں۔ بلکہ وہ سامنے کی سمت میں نظریں جمائے کسی غیر مرئی نقطے کو تک رہی تھی۔

میں اور علی فوراً کچھ بھی نہ بول سکے اور جب تک ہم نے الفاظ جمع کیے وہ خود ہمیں ٹوک گئی۔

"دیکھیے پلیز اب کنڈولنس تعزیت مت شروع کر دیجیے۔ جو ہوا سو ہوا۔ ہر انسان کو زندگی صرف ایک بار ملتی ہے سامنے اپنی چوائس سے برتنا اس کا حق ہے۔" بالوں کی لٹیں پیچھے کرتے ہوئے وہ عاجزی سے کہتے کہتے سنجیدہ ہو گئی۔

"ہاں مگر ماں کی محبت پر تمہارا بھی تو حق ہے۔" میں اس بار بڑے دھیان سے بولا تھا۔ شاذ نے یکدم ٹھٹھک کر میری طرف دیکھا اور سرخ ہوتے چہرے سمیت میری طرف مڑی۔

"مجھے ترس کھانے والے لوگوں سے نفرت ہے مسٹر اور اگر کوئی مجھے ان نظروں سے دیکھے تو میں اسے۔"

"ٹیچنگ کروا دیتی ہوں۔ ٹل ڈیتھ۔ نہیں بلکہ کورٹ مارشل۔"

عمر نے اس کی بات اچکتے ہوئے کچھ اس بے ساختگی سے کہا کہ وہ جھینپ سی گئی۔

"ارے بھائی الجھنے کی باتیں کیوں کرو۔ کیا تم ہر وقت مرنے مارنے پر تلی رہتی ہو۔ ابھی دوستی کا پیغام ملا اور ابھی جنگ اسٹارٹ ہو گئی۔ یہ ہے تمہارا اسٹائل۔" عمر نے بڑے مزے سے دوستی بھی گانٹھ لی تھی جبکہ میں شاذ کے پل پل بدلتے موڈ کو دیکھ کر خاموش ہو رہا تھا۔

"یہی سمجھ لو۔" وہ شانے اچکا کر ایک بار پھر مسکرا دی تھی۔

یہ تھیں ہمارے اول روز کی وہ ملاقاتیں اور پھر اس کے بعد شاذ ہمارے گروپ کا ہی نہیں میرے دل کا بھی اٹوٹ حصہ بن گئی۔

گو کہ اس میں اور مجھ میں کوئی قدر بھی مشترک نہیں تھی۔ وہ ایک پر اعتماد اور کھلے ذہن کی با اختیار لڑکی تھی۔ جبکہ میں لیا دیا پر اعتماد ہوتے ہوئے بھی فیصلہ کرنے سے گریز کرنے والا ایک ایسا شخص تھا جسے اپنے روایت پرست خاندان سے اختلاف ہونے کے باوجود بھی شاذ کا یوں شتر بے مہار کی طرح گھومنا پھرنا پسند نہیں تھا۔ ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے بھی میں اسے پسند کرتا تھا۔ بلکہ دھیرے دھیرے اس کی ذات کا سحر مجھے اپنے طلسمی حصار میں قید کرتا گیا تھا۔

اس کی بہت سی عادتوں میں ایک عادت بہت بری تھی کہ وہ ہر کسی کے ساتھ بے تکلف ہو جاتی تھی۔ خصوصاً "مرد حضرات" سے اور اس کی منطق وہ یہ پیش کرتی کہ اسے بچپن سے ہی پاپا نے دوستوں کی طرح رکھا ہے اس لیے اس کی دوستی محض حضرات سے ہو سکتی ہے۔ (جب ہی ہم سے بھی تھی)

اکثر وہ فلائیٹ پر ہی رہتی اس کے فرسٹ کزن ہمارے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھے لہٰذا حاضری کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی اٹینڈنس لگا دی جاتی تھی۔ اس کے اس رویے پر بھی کبھی میں بری طرح جھلس جاتا تو اسے کھری کھری سنا دیتا۔

"تم یہ فضول جاب چھوڑ نہیں سکتیں۔" ایک روز میں پھر الجھ اٹھا تھا۔

"کیا؟ خدا کو مانو فرزان! تم اس جاب کو فضول کہہ رہے ہو جانتے ہو ایک دنیا مرتی ہے اس کے لیے کشش، گلیمر، سیاحت اور آسمانوں کی سیر کتنا چارم ہے اس میں۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے۔"

وہ ایک جذب سے کہہ رہی تھی۔

"سچ میری خواہش ہے کہ میں ہمیشہ ان آسمانوں میں اڑتی رہوں، اڑتی رہوں ——— حتیٰ کہ افق کے اس پار چلی جاؤں جہاں۔"

"جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔" عمر نے بیچ میں لقمہ دیا تو وہ ہنسا گئی۔ جبکہ وہ گویا تھا۔

"ارے محترمہ! اتنی لمبی پرواز کی تو فیول ختم ہوتے ہی کریش لینڈنگ ہو گی آپ کی اور لوٹ کے بدھو گھر

آئے کے مصداق زمین پر ہی ٹھکانا ملے گا آپ کو سمجھیں۔"

عمر کو میرے جذبات کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ مفاہمت کی راہ چل کر شاز کو وہ تمام کام کرنے سے روکنے کی سعی کرتا جو مجھے ناپسند تھے۔

"نکومت۔" وہ چڑ گئی۔

"بات کو سمجھو شاز، یہ پروفیشن کوئی ایسا باعزت بھی نہیں کہ اس کے لیے وقت ضائع کیا جائے۔ رہ گئی سیلری کی بات تو میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں فائننشل سیکورٹی کے لیے جاب کرنے کی ضرورت ہے۔"

"ہر کام ضرورت کے لیے نہیں کیا جاتا فرزان، بعض چیزیں ہماری خواہش کے دائرے میں بھی آتی ہیں۔ جیسے میرا پروفیشن۔"

وہ صدر درجے سنجیدہ ہو چلی تھی۔ اس کی بات پر مجھے یکدم ولید کی بات یاد آ گئی۔ "کتنا ٹھیک کہا تھا اس نے کہ احتیاج اور خواہش میں فرق ہوتا ہے۔"

عمر کے چہرے سے بھی یہی لگ رہا تھا کہ اسے ولید کی بات یاد آ گئی ہے۔

"کمال ہے شاز آج تو تم نے ولید کی یاد تازہ کر دی۔ اس کے فلسفے کو عملاً" ہمارے سامنے دہرا دیا۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا تو شاز سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

"ارے بڑا فلسفی ٹائپ بندہ تھا۔ اب تو محترم وار زون میں کھیل رہے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ یہاں ڈگری کے کاغذ جمع کرنے میں ہی زندگی گنوائے جا رہے ہیں۔"

عمر نے قصداً "ایک تو بھری تھی۔ میں تو یوں بھی جلا ہوا تھا۔ اسے ہی لتاڑ دیا۔

"تو کیا ضرورت ہے۔ یہاں فالتو کاغذ جمع کرنے کی تم بھی چلے جاؤ امریکہ۔"

"ارے کس کافر کا دل چاہتا ہے یہاں رہنے کو مگر وہ جو میرے معزز چچا جان ہیں۔ ان کی شرط ہے کہ پہلے کچھ بن کر دکھاؤ اور تمہیں تو معلوم ہے کہ ان کی دختر نیک اختر آنسہ شزینہ مجھے کس قدر عزیز ہیں۔ بس اس عشق نے ہم کو قید کر رکھا ہے۔"

"تم ناشکرے ہو عمر! بن مانگے مل رہا ہے نا اس لیے"

شاز عمر کے مسخرے پن پر ہنستے ہوئے اسے ستانے لگی اور قصداً "میرا غصہ اور میری فرمائش نظرانداز کر گئی۔

"ہاہا بن مانگے موتی ملے، مانگے ملے نہ چھتر۔"

عمر نے ولید کا جملہ اس کے ہی انداز میں دہرایا تو مجھے بھی اپنی مسکراہٹ روکنا مشکل ہو گئی۔

"بس یار! اسی طرح ہنسا بولا کرو۔ سچ تم لوگوں کے جھگڑوں سے تو میں بہت پریشان ہو چلا ہوں۔ تم سے اچھا تو ولید تھا۔ کبھی جو ناراض ہوا ہو۔"

--*

مجھے یقین تو نہیں مگر یہی سچ ہے
میں تیرے واسطے عمریں گزار سکتا ہوں
یہی نہیں کہ تجھے جیتنے کی خواہش ہے
میں تیرے واسطے خود کو بھی ہار سکتا ہوں

باوجود میرے لاکھ چاہنے اور منع کرنے کے شاز کی سرگرمیاں وہی تھیں۔ البتہ اب اس نے قدرے کم چھٹیاں کرنی شروع کر دی تھیں۔ پھر یہ بھی تھا کہ سمسٹرز سر پر تھے کہ اچانک ڈیپارٹمنٹ میں نیناوقار کی خبریں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئیں۔

جامعہ کے سب سے ہونہار طالب علم اظفر کو بھی نینا نے اپنی طرح داری، اپنی اداؤں اور اپنے حسن سے دیوانہ بنا ڈالا تھا۔ اچانک چھوڑ کر وہ کسی نئے بندے کے ساتھ دیکھی جانے لگی تھی۔ خبر اظفر کی دلچسپی اور توجہ کی طالب تھی کیونکہ پچھلے کئی مہینوں سے "رومیو جیولٹ" کا تمثیلی مظاہرہ سب نے ہی دیکھا تھا اور بہت توجہ سے دیکھا تھا۔

فطری طور پر سب ہی اس خبر سے متاثر ہوئے۔ لڑکے لڑکیاں بھی اظفر کی تباہ شدہ حالت اور نینا کی بے حسی پر اسے برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ بعض برملا لڑنے بھی پہنچ گئیں۔ جس پر نیناوقار نے تمام اخلاقی ضابطے پس پشت رکھتے ہوئے سب کو کھری کھری سنا ڈالیں۔

"یہ اظفر اور میرا معاملہ ہے۔ میں دوسروں کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتی۔ یوں بھی جب اظفر مجھ سے جواب دہی نہیں کر رہا تو تم سب کون ہوتے ہو۔"

اس نے صاف کھرے اور دبنگ انداز میں کہہ کر سب کو گویا سانپ ہی سنگھا دیا۔

شاز کو جس لمحے اس ساری روداد کا پتا چلا۔ کوک کا سپ لیتے ہوئے فوراً گردن ہلانے لگی۔

"بالکل ٹھیک کہا نینا نے۔ بھئی لوگوں کو کیا ضرورت ہے کسی کے پرسنل معاملے میں دخل در معقولات کرنے کی۔"

"مگر نینا کا رویہ بہت انسلٹنگ تھا۔ ایک تو چوری اور سے سینہ زوری۔ پہلے تو اظفر بے چارے کو خواہ مخواہ ضد میں آ کر اپنی زلف گرہ گیر میں الجھایا اور جب وہ کسی کام کا نہیں رہا تو اسے چھوڑ کر چل دی۔"

عمر کی ساری ہمدردیاں اپنے ہم جنس کے ساتھ تھیں، میری خاموشی بھی حامی تھی اس کی۔

"خیر یہ تو تم مت کہو۔ اظفر کوئی اسکول کو جانے والا بچہ نہیں تھا کہ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر بھی بالفرض ہم یہ مان بھی لیں کہ نینا نے غلط کیا تو تم ان تمام لڑکوں کو کیا کہو گے جن کی محبت کے جھانسے میں ٹریپ ہو کر لڑکیاں اپنا سب کچھ حتیٰ کہ زندگی تک گنوا دیتی ہیں۔ تو مائی ڈیئر فرزان اب یہ ایک طرح کا ٹرینڈ بن گیا ہے۔ سب ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے ہیں کوئی اپنی تفریح کے لیے کوئی انتقام کے طور پر تو کوئی اچھا وقت گزارنے کی خاطر۔ تم کس کس کو روؤ گے۔ کس کس کے لیے اپنا خون جلاؤ گے۔ بھول جاؤ سب کچھ۔"

وہ کولڈ ڈرنک میز پر رکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں دبے دبے جوش کے ساتھ کہہ رہی تھی میں اور عمر قدرے متاثر ہو گئے۔ کچھ غلط کہا بھی نہ تھا اس نے۔

"ٹھیک ہے جو تم نے کہا وہ بھی صحیح ہے۔ مگر غلط روش کو محض اس لیے اپنا لیا جائے کہ اکثریت اسے فالو کرتی ہے یہ محض حماقت ہے۔"

میں نے اپنی خاموشی کو کافی دیر بعد توڑا تھا جس پر وہ کھل کر مسکرائی۔

"اب یہی حماقت یہاں کا چلن ہے فرزان۔ میں تو ان لڑکیوں کو قطعی طور پر غلط نہیں سمجھتی جو اس سوسائٹی کی ہم نہاد اخلاقی اقدار جن کی پاسداری صرف صنف نازک کے لیے ہی مخصوص کر دی گئی ہے کو ریجیکٹ کرتی ہیں۔ آخر عورت ہی کو کیوں سمجھوتے اور قربانی کے لیے مجبور کیا جائے۔"

کولڈ ڈرنک کے سپ لیتے ہوئے اپنے شولڈر کٹ بالوں کو پیچھے کی جانب جھٹک کر سلسلۂ کلام توڑتی ہوئی وہ بہت اعتماد اور شان استغناء سے کہہ رہی تھی۔

"بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عورت ہو یا مرد دونوں کو زندگی گزارنے کے لیے اتنی آزادی تو ضرور ہی ملنی چاہیے کہ جس کے ساتھ وہ چاہے زندگی گزارے اور جس سے چاہے منہ موڑ لے۔ جیسے کہ میری مما نے کیا۔ مجھے بھی ان سے شکایت نہیں ہوئی۔ کیونکہ مجھے اندازہ ہے کہ اگر وہ پاپا کی فیملی میں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کرتیں تو وہ خود تباہ ہو جاتیں اور مما کیا محض پچھتاتیں۔ نینا نے ایک بولڈ قدم اٹھا لیا ہے۔ آئی رئیلی اپری شی ایٹ ہر۔"

ہم دونوں کے چہروں پر پھیلتے ناگواری کے تاثرات کو بغور نظروں سے دیکھتے ہوئے بھی وہ مطمئن سی بول رہی تھی۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اسے اس بات کی مطلق پروا نہیں کہ اس کی گفتگو مخاطب کو کس قدر ناگوار گزر رہی ہے۔

"اوہ کم آن تم لوگ تو مائنڈ کر گئے۔ مگر یہ سچ ہے عمر!"

وہ خاموش ہوئی تو ہم دونوں کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر ہنسی پھر سنجیدہ ہو گئی۔

"تعلق بوجھ بن جائے تو اسے توڑنا اچھا۔ ایسے رشتے استوار کرنے کا فائدہ جنہیں کل توڑنا پڑے۔"

اس کی بات کے اختتام پر ہمارے کچھ کہنے سے پہلے ہی سر بیگ کی کلاس کا وقت ہو گیا تو ہم تینوں مزید کسی بحث میں پڑے بغیر پے منٹ کر کے کینٹین سے باہر آ

گئے۔

بظاہر تو اس روز کچھ نہیں ہوا تھا۔ لیکن میں شاز کے خیالات سن کر کچھ پریشان ہو اٹھا تھا۔ گو کہ اولین دنوں میں ہی اس کی شخصیت کا بہت اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو سات پردوں میں چھپا کر رکھنے کی عادی نہیں تھی۔ جس کی بنا پر میں پہلے ہی محض ایک پر اعتماد اور زندگی کو جدید فلسفے کی بنیاد پر گزارنے کی حامی لڑکی سمجھتا تھا۔ یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ اس حد تک آزاد خیال ہے۔

میرے روایت پرست خاندان میں اس کے لیے سوائے جبر اور گھٹن کے کچھ نہیں تھا۔ جبکہ میرے گھر والوں کو اگر اس کے پیشے اور خیالات کی ذرا بھی بھنک پڑ جاتی تو وہ پہلی فرصت میں ہی مجھے عاق کرنے کی دھمکی دے ڈالتے۔ میں ان دنوں سخت کشمکش میں تھا کہ سمسٹرز کا شیڈول اناؤنس ہو گیا۔

کچھ عمر کی ذات پھٹکار کا اثر تھا اور کچھ اپنی ڈیڑھ سال کی محنت کا خیال۔ مجھے سب کچھ بھلا کر کتابوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

میری طبیعت میں ٹھہراؤ بہت زیادہ تھا۔ شاید اسی لیے میں جب کوئی فیصلہ کر لیتا تو اس پر ڈٹ جانا میری عادت بن گئی تھی۔ یہی حال اس معاملے کا تھا جس کا براہ راست تعلق شاز ناصری سے تھا جبکہ دوسری جانب میری فیملی تھی جس سے حمایت نہ ملنے کا مجھے صد فیصد یقین تھا۔

اسی کشمکش میں سمسٹرز بھی گزر گئے۔ شاز صرف پیپر دینے کے لیے ہی آ سکی اس کا فلائیٹ شیڈول آج کل بہت سخت تھا۔ اس کی غیر موجودگی کے باعث ہی عمر کو میرا مطالعہ کرنے کی اچھی خاصی فرصت مل گئی۔

"کیا مسئلہ ہے تیرا۔ ارے بھائی! زبان بھی کھول دیا کر کبھی۔"

وہ ہفتے بھر سے میرے پیچھے پڑا تھا۔ مگر میں اس کے ہاتھ نہیں آیا لیکن آج اس نے مجھے گھر پر آ گھیرا تھا۔

"کچھ نہیں ہوا ہے۔ لو یہ سی ڈی سنو۔"

میں نے سی ڈی پلیئر پر ڈسک لگاتے ہوئے کہا تو اس نے سنجیدگی سے آگے بڑھ کر مین سوئچ ہی آف کر دیا۔

"پلیز فرزان! مجھے ٹالو مت مجھے لگتا ہے تم کچھ ضرورت سے زیادہ اپ سیٹ ہو۔ بس جھوٹ مت بولنا یار۔"

مجھے کچھ بولنے کا موقع دیے بغیر وہ بلا توقف بولا تو میں سر جھکا کر مسکرا دیا۔

"کوئی خاص وجہ نہیں ہے یار۔"

میں جیسے تھک کر بولا تھا۔ عمر کو ٹالنے کے لیے ذہن کا حاضر ہونا ضروری تھا۔ جبکہ میں اس وقت بالکل ڈل ہو رہا تھا۔

"وہ تو مجھے بھی اندازہ ہے کہ وجہ کوئی عام ہی ہے اور وجہ کی "وجہ" بھی عام سی۔" وہ خاصے بقراطی انداز میں بولا تھا۔ مجھے ٹھٹھکنا تو تھا ہی۔ میں نے اچنبھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ مزید سنجیدہ ہو گیا۔

"دیکھو فرزان! ایک بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میں صرف تمہارا دوست ہی نہیں بہی خواہ بھی ہوں۔ گڑھے میں گرنا چاہو گے تو میں تمہیں بچانے کی حتی الامکان کوشش کروں گا پھر بھی اگر تم نہ رکو تو بھی تمہیں دھکیل کر ہمیشہ کے لیے اذیت میں مبتلا کرنے والی جھنجلاہٹ نہیں ہے مجھ میں۔" اس نے تمہید لمبی چوڑی باندھی تھی۔ میں مزید الجھ گیا۔

"کیا مطلب؟ میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔"

"سمجھو گے بھی نہیں۔ نام تو فرزان ہے مگر عقل بالکل ہی ناپید ہے تم میں۔ ایک ایسے رستے پر چل نکلے ہو جس کی کوئی منزل نہیں۔ ساری عمر بھی چلتے رہو تو ڈیڈ اینڈ dead end پر منہ کی کھانے کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔"

"عمر پلیز صاف کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے پیشتر ہی روک دیا۔

"یہی کہ شاز ناصری سے تمہارا کوئی جوڑ نہیں۔ تم غلط سمت میں دیکھ رہے ہو۔" میرے لہجے میں جو تنبیہہ تھی اس کے جواب میں اس نے صاف لفظوں میں وہ کچھ کہہ دیا تھا جو میں لاشعوری طور پر سوچنے کے باوجود اپنے سامنے دہرانا نہیں چاہتا تھا۔

"عمر!" میں جیسے دنگ رہ گیا تھا۔

"نہیں فرزان کوئی لاجک مت دینا یار! وہ لڑکی ہم جیسوں کو نہیں مل سکتی۔ ہم تم چاہے کتنی ہی ترقی کر جائیں۔ عورت کے معاملے میں وہی کنزرویٹو اپروچ رکھیں گے جو ہمارے خون میں شامل کر دی گئی ہے۔ اب خواہ یہ ٹھیک ہے یا غلط طریقہ ہے کہ جس فیملی سے تم اور میں تعلق رکھتے ہیں وہاں ایسی لڑکیوں سے دوستی تو کرنے کی اجازت مل سکتی ہے انہیں اپنی بیوی بنانے کی نہیں۔"

وہ میری ایک بات سننے کو تیار نہیں تھا بولتا چلا گیا۔

یہ وہی عمر تھا جو شاز کی کمپنی میں سب سے زیادہ مسرور اور سب سے زیادہ خوش نظر آتا تھا۔ جسے شاز کی غیر موجودگی کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ مگر اس لمحے اس کے لہجے میں شاز کے لیے تحقیر اور تنفر نہ سہی مگر وہ احترام اور عزت بھی نہیں تھی جس کی کہ ایک لڑکی حقدار ہوتی ہے۔

فطری طور پر مجھے اس کا یہ لہجہ سخت گراں گزرا تھا۔ مگر میں فوری رد عمل دینے کا بھی عادی نہ رہا تھا۔ سو برداشت کر گیا۔

"اور اگر میں یہ کہوں کہ مجھے ایسی کسی اجازت کی ضرورت ہی نہیں ہے تو؟" توقف کے بعد میں نے وہ کہہ دیا تھا جو سوچا تک نہ تھا۔ عمر لمحے بھر کے لیے متحیر ہوا پھر بولا۔

"تو کیا؟ تم کیا سمجھتے ہو شاز ناصری جیسی لڑکیاں شادی کر کے گھر بسانے اور بچوں کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے راضی ہو سکتی ہیں۔ نو مائی ڈیئر فرینڈ اگر تم ایسی کوئی امید رکھتے ہو تو میں یہی کہوں گا کہ تم "احمقوں کی جنت" کا دروازہ کھولے جھانک رہے ہو۔"

عمر کا طرز گفتگو نہ صرف چونکا دینے والا بلکہ بھڑکا دینے والا بھی تھا۔ مگر مجھے بھی ضبط کی عادت تھی۔

"تم یہ دعوے قبل از وقت کر رہے ہو عمر۔"

"اور تم خوامخواہ امیدیں باندھے بیٹھے ہو۔" وہ برمحل اور برملا بولا تھا مجھے چند لمحے تو جیسے لفظ ہی نہ سوجھے۔

"مگر تم یہ سب کیسے کہہ سکتے ہو۔" میں نے حتی المقدور خود کو رسانیت سے بولنے پر آمادہ کر لیا تھا۔

"ایسے کہ میں شاز ناصری کو تم سے زیادہ پہچان گیا ہوں۔ کہتے ہیں عشق اندھا ہوتا ہے مگر تمہیں دیکھ کر تو اندازہ ہوتا ہے کہ بہرا اور عقل سے پیدل بھی ہوتا ہے۔ یار حد ہوتی ہے جذباتیت کی بھی۔ سوچو ذرا جس لڑکی کی سوچ اتنی "لبرل" لائف اسٹائل اتنا قابل اعتراض اور پروفیشن اس قدر آزاد ہے۔ تم اسے لائف پارٹنر بنانے چلے ہو وہ بھی ایسے خاندان کا فرد ہوتے ہوئے جہاں روایتوں پر جان دی جاتی ہے۔"

وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے بمشکل بھنویں سکیڑتے ہوئے خود کو اب تک پرسکون رکھا ہوا تھا مگر کب تک۔

"میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں شاز کے کیریکٹر پر کیچڑ اچھالنے کی این او سی ملی ہوئی ہے۔ عمر! بغیر کسی ثبوت کے اتنا بڑا اور اس قدر رکیک الزام مت لگاؤ اس پر۔"

باوجود ضبط کے میرے لہجے میں بے لچک سی اور خشونت اتر آئی تھی۔ عمر میری آنکھوں سے ہویدا برودت اور سرد مہری پا گیا تھا۔ لب بھینچ کر مجھے دیکھنے لگا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"او کے پھر انتظار کرو وقت کا۔"

اور اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ گہرے تاسف اور کچھ کھو دینے کے احساس نے مجھے گرفت میں لے لیا تھا۔ مگر میں سر جھٹک کر رہ گیا۔ یقین تھا کہ وہ ناراض نہیں محض ایک جھٹکا دے رہا ہے مجھے۔

اور یہ یقین دوسرے روز ثابت بھی ہو گیا۔ وہ واقعی حسب سابق ہنستا مسکراتا ہشاش بشاش یونیورسٹی میں میرا منتظر تھا۔ حتی کہ اس روز اچانک آ جانے والی شاز سے بھی اس کا رویہ ہنوز دوستانہ تھا البتہ اس روز کے بعد سے اس نے مجھ سے اس معاملے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنے خیالات اور دعووں میں خود کو کتنا سچا سمجھتا ہے۔

*_*_*

ان ہی دنوں میری ذات کی الجھنوں نے میرے

اور گرد بھی انتشار پھیلانا شروع کر دیا۔ خاص طور پر میرے گھر والے میرے بدلتے رویے پر چونکنے لگے تھے۔ اندازہ تو عمر اور دوسرے ملنے جلنے والوں کو بھی ہوا۔ مگر کسی نے استفسار نہ کر کے مجھے اور تنہا کر دیا۔ خدا جانے سب نے اس معاملے میں کیا کیا مفروضے قائم کیے تھے۔

ربیک کی علالت کی وجہ سے ہماری کئی دن کلاسز ریگولر نہ ہو سکیں تو ہم تینوں ان کے گھر جا پہنچے۔ خیریت دریافت کرنے اور عیادت کرنے کے علاوہ یہ بھی فکر تھی کہ وہ کب دوبارہ جوائن کریں گے۔

واپسی میں شاز ہم دونوں کے سر ہو گئی کہ اس کے گھر چلا جائے جو قریب میں ہی واقع تھا۔ لہٰذا جانا ہی پڑا۔ اتفاق سے اس روز گھر پر اس کے والد کے ساتھ ساتھ ملازمین بھی غائب تھے۔

"آئی ایم رئیلی سوری فرینڈز کہ گھر میں تو کچھ بھی نہیں ہے پیٹ پوجا کے لیے۔"

ہم لوگ یونیورسٹی سے سیدھے ربیک کی طرف گئے تھے لہٰذا اب پیٹ بالکل خالی ہو چکا تھا۔ شاز کو اندازہ تھا اس لیے ایک ایک کیبنٹ کھول کھول کر جھانکتے ہوئے وہ کافی نادم نظر آ رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ چلو باہر چل کر کچھ کھا لیتے ہیں۔"

میں نے عمر کی طنزیہ نظروں سے صرف نظر کرتے ہوئے حل پیش کیا۔

"اتنی گرمی میں باہر جا کر لنچ۔ قطعاً نہیں۔" عمر نے قصداً اُڑا دیا گیا تھا۔

"سورج سوا نیزے پر آ گیا ہے جو اتنا جلا رہے ہو۔"

مجھے درحقیقت اس وقت عمر کی ڈھٹائی پر سخت تاؤ آ گیا تھا جبکہ وہ مجھے جھلاتا دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"اوہ کم آن فرزان جانے دو یہ۔ کچھ بھی تو ڈال گئے ہیں۔ فی الحال اس سے کام چلا لیتے ہیں۔" وہ مفاہمت سے کتنی پیالی ہوا تسلی کرنے لگی۔ میں جھلا کر رہ گیا۔ جبکہ وہ مزے سے ہمارے ساتھ کچن میں پڑے اسٹول پر آ بیٹھی تھی۔

"مجھے تو گھر داری کا ذرا سینس نہیں۔ وہ تو بیا یا نے ممّا کے جانے کے بعد یہ ملازمہ رکھ دی ورنہ تو جانے کیا ہو جاتا۔" اس نے جیسے جھرجھری لیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"ہونا کیا تھا خود جلی ادھ جلی روٹیاں پکاتیں اور خود ہی مزے لے کر کھاتیں۔" عمر نے استہزائیہ انداز میں مضحکہ اڑایا تھا۔ وہ بھی بُرا نہیں بس ہنس پڑی جبکہ میں عمر کا انداز جانچ رہا تھا۔

"توبہ عمر! میں تو مر کر بھی نہیں کر سکتی یہ کوکنگ وکنگ۔ سچ مجھے تو حیرت ہوتی ہے عورتوں پر۔ کیسے اپنا رنگ روپ تباہ کرتی ہیں کچن میں گھس گھس کے۔"

اس کے رعونت انداز پر عمر نے بے ساختہ ہنستے ہوئے مجھے دیکھا تھا۔

"اصل میں انہیں بچپن سے یہ ٹریننگ دی جاتی ہے کہ مرد کے دل تک پہنچنے کے لیے انہیں معدے کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔" وہ میری خوش خوراکی پر ہنس رہا تھا۔

"لیکن نان سنس وِٹش پہ بھی کوئی لاجک ہے۔ مرد کا دل نہ ہوا کار نری کی دکان ہو گئی کہ نکلے اور کٹ سے پیٹ بھرے سودا لے لیے۔ اس طرح تو کوئی بھی کسی کے دل پر قابو پا سکتا ہے۔ کتنی احمقانہ سی بات ہے۔" اس نے سر جھٹک کر توے کی طرف دیکھا۔ پانی ابل چکا تھا۔ لہٰذا پیکٹ پر لکھی ترکیب پڑھتے ہوئے اس نے بمشکل نوڈلز تیار کیے اور سامنے لا رکھے۔

"تو کھاؤ تم لوگ بھی ہو کیونکہ میں نے فرسٹ ٹائم کسی کے لیے کچھ پکایا ہے۔"

کیا احسان جتانے کا انداز تھا میں جل کر رہ گیا۔ جبکہ عمر مستقل طنزیہ باتیں کرتا قہقہے لگاتا رہا اور شاز اس کے دائیں جانب بیٹھی اس کی پلیٹ سے کھاتے ہوئے برابر ہنستی رہی۔ کبھی کبھی عمر کی کسی بات پر وہ اس حد تک بے قابو ہو کر ہنستی کہ اس کے شانے سے سر ٹکا دیتی۔

اس روز واقعی میں نے اپنے ضبط کی حد آزمائی تھی۔ حقیقتاً مجھے شاز کی شخصیت کے اس پہلو نے مزید سوچنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن میں جتنا سوچتا نتیجہ وہی نکلتا۔ دل و ذہن میں ایک جنگ سی چھڑی تھی۔ دل

سے توقف سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہ تھا۔

پھر یوں ہوا کہ میں نے قصداً اس معاملے میں خاموشی اختیار کر لی۔ نہ دل سے کچھ کہتا نہ دماغ کو قائل کرنے کی کوشش کرتا۔ لہٰذا دن کچھ بہتر گزرنے لگے کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ گھر میں کوئی کھچڑی سی پک رہی ہے۔

بھابی بھیا اور اماں جان کے چہرے پر ہر وقت ایک مسکراہٹ ایک سرخوشی نظر آتی۔ میں اپنی اوائل عمری سے ہی سب سے الگ تھلگ رہا ہوں۔ بہن بھائیوں سے کھلنا ملنا نہ والدین سے بے تکلفی مجھے شروع سے تنہا رہنے کی عادت تھی۔ گھر میں آ کر کھانا اور سو جانا ان دو کاموں کے سوا میرے لیے گھر کا کوئی مصرف نہ تھا۔ شاید اس لیے کہ شروع سے ہی آغا جان کی جبری پابندیاں اور غیر ضروری پابندیاں مجھے گھر سے متنفر کر گئی تھیں۔ اسی وجہ سے میں چھٹیاں بمشکل گھر میں گزارا کرتا تھا۔

یہ نہیں تھا کہ مجھے گھر والے اچھے نہیں لگتے تھے یا میں آوارہ بادل کی طرح پھرنا پسند کرتا تھا۔ بلکہ اصل بات تو یہ تھی کہ اس گھر کی روایتوں سے میں سخت الرجک تھا۔ گو کہ آغا جان اور اماں جان نے میری ہر خواہش پوری کی تھی۔ پھر بھی ایک تشنگی میرے اندر بچی رہی تھی اور وہ پیاس تھی آزادی کے حسین احساس کی تمام تر خوب صورتیوں کو سمیٹتے ہوئے زندگی گزارنے کی۔

جبکہ یہاں خاندان برادری والوں اور رواجوں نے جکڑ رکھا تھا۔ لہٰذا میں دھیرے دھیرے سب سے کٹتا چلا گیا اور میری طبیعت میں سنجیدگی اور خاموشی کے رنگ بھرتے چلے گئے۔

گھر میں کیا ہو رہا ہے کیا نہیں یہ جاننے کی میں نے کبھی ضرورت محسوس کی نہ خواہش۔ مگر اب ایسا لگتا تھا جیسے سب کی معنی خیز نظروں کا ارتکاز مجھ پر ہے۔ لہٰذا مجھے اپنی بے نیازی ترک کرنا ہی پڑی اور جواب میں اماں جان سے جو کچھ سننے کو ملا۔ اس سے مجھے حیرت تو نہیں ہوئی البتہ ایک شدید اور طوفانی جلال نے یکدم ذہن میں مجھ پر حملہ کیا تھا۔

مجھے میری چچا زاد نروشہ سے منسوب کر دیا گیا تھا بغیر بتائے بنا پوچھے۔ حیرت کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ یہ ہماری روایتوں میں سے ایک تھی۔ مگر جو رویہ میں نے برسا برس سے تمام گھر والوں کے ساتھ روا رکھا۔ اس کے بعد تو انہیں احساس ہو جانا چاہیے تھا کہ میں ان سے کس قدر مختلف تھا۔

"نہیں اماں جان۔ میری پسند تو صرف شاز ناصری ہے اور اس کے سوا میں کسی کے بارے میں کچھ نہیں سوچ سکتا۔"

میرے بلند آواز اور آتشیں لہجہ ان دیواروں نے پہلی بار سنا تھا۔ شاید اسی لیے گھبرا گئی تھیں اور دل تو اماں جان بھی گئی تھیں جن کے لیے میرے لبوں سے نکلے الفاظ گویا زہر میں بجھے تیر تھے یا شرارے اگلتے نشتر وہیں کلیجہ تھام کر بیٹھ گئیں۔

ان کی آہ و بکا اور لعن طعن سے میرا دماغ اور خراب ہو گیا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ نروشہ میں آخر کیا برائی ہے جبکہ مجھے تو سرے سے یاد ہی نہیں تھا کہ نروشہ آخر کو کسی چچا زاد ہے۔ کبھی ملتے ہوئے بات کی ہوتی تو پتا چلتا اور کسی میں نے کہہ دیا تھا۔ جس پر وہ جیسے بلبلا اٹھیں۔

"ارے شرم کر لڑکے تجھے کیا نمائش لگا کر دیتے لڑکیوں کی اور پھر فیصلہ تجھ پر چھوڑتے ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے ایسی ذاتی تو نہیں کی۔"

اماں جان بیسویں صدی میں رہتے ہوئے بھی بارھویں صدی میں جی رہی تھیں۔

"یہ میرا حق ہے اماں جان! کوئی گناہ کبیرہ نہیں کہ میں نے اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"اپنی پسند کی لڑکی۔" یہ دوسرا شاک تھا۔ اماں جان تو مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھے گئیں۔ "ہائے میرے مالک آخر ایسا کون سا گناہ کیا تھا میں نے۔ اب اس کے آغا جان کو کیا منہ دکھاؤں گی۔" بھابھی کے کندھے پر سر رکھ کر وہ زار و قطار رو دی تھیں۔

گھر میں جیسے حشر ہو گیا تھا۔۔۔۔ جبکہ بات آغا جان تک جا پہنچی اور وہیں ہوا جس کی کہ مجھے توقع تھی

آغاجان غصے سے بپھرے میرے سر پر آپہنچے تھے۔

"بہت خوب صاحبزادے یہ ___ گل کھلائے جا رہے ہیں یونیورسٹی میں۔"

ان کا انداز گفتگو ہمیشہ سے ایسا ہی رہا تھا جس کے باعث میں ان سے کم ہی مخاطب ہوتا تھا۔ اس وقت بھی چپ چاپ اٹھ کھڑا ہوا مگر ضبط کی شدت سے رگیں تن گئی تھیں۔

"میں کہتا ہوں تمہاری جرأت کیسے ہوئی انکار کی۔ خاندان میں میری ناک کٹوائی ہے تم نے۔ برادری سے باہر شادی کا کوئی تصور نہیں ہمارے یہاں۔ سمجھاؤ اپنے لاڈلے کو۔"

غیض و غضب کی حالت میں انتہائی سختی سے کہہ رہے تھے میں نے بمشکل جھکا سر اٹھایا۔

"کیا غلط کیا ہے آغاجان۔ شاز ایک اچھی لڑکی ہے۔"

"ہونہہ اچھی لڑکی کہلاتی ہے۔ سنا ہے ہوا کی بیٹی [illegible] جس کے باپ کو خود عیاشیوں سے فرصت نہیں اور خود لڑکی آوارہ اور آزاد خیال والا۔"

وہ اپنی اطلاعات [illegible] کہتے ہوئے انتہائی طیش میں کمرے سے نکل گئے۔ میں ششدر رہ گیا۔ جبکہ بھابھی بھیا اور امی جان کے منہ سے تو چیخیں نکل گئی تھیں۔

"آپ سے یہ سب کس نے کہا آغاجان۔"

تحیر سے نکلتے ہوئے میں نے دریافت کیا تو وہ استہزائیہ مسکرا دیے۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ آنکھیں بند کر رکھی ہیں تمہاری طرف سے میں نے میں تو پہلے ہی کھٹک گیا تھا۔ عمر سے تمہاری بقراطیت بھری گفتگو بھی سنی تھی اور اس لڑکی کا حدود اربع بھی معلوم ہوا تھا۔ ارے ناہنجار لڑکے تمہیں ساری دنیا چھوڑ کر یہی تو وہ ملی۔"

نجانے کون سے الفاظ کی ڈالے تھے انہوں نے مگر میرے اندر جیسے آگ لگ گئی تھی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"آغاجان دیکھیے۔"

"بس فرزان بیٹے۔ کل ہم تمہارے چچا کے یہاں جا رہے ہیں رسم ادا کرنے پرسوں وہ آئیں گے میں اس روز تمہیں گھر میں دیکھنا پسند کروں گا۔"

وہ لمحے بھر میں فیصلہ سنا کر چلے گئے۔ میں نے ایک ایک کی طرف دیکھا۔ ہر کوئی نظر بچا کر کمرے سے نکل چلا گیا تھا اور میں جیسے کمزور ہو کر خود سے ہی لڑنے لگا۔

کیا ضروری تھا کہ مجھے شاز ہی سے محبت ہوتی۔ کیا لازمی تھا کہ وہ ایسے بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھنے والی ہوتی اور کیا ہو جاتا جو میرا خاندان روایتوں کا قیدی نہ ہوتا۔

*_*_*

دوسرے دن میں پورا وقت کمرے میں پڑا رہا۔ یونیورسٹی کا قطعاً موڈ نہیں تھا حتیٰ کہ میں نے بھابھی کے کہنے پر بھی عمر کا فون ریسیو نہ کیا اور شام ہوتے ہی شاز کے گھر چلا گیا نجانے اس روز میں کہاں جانا چاہتا تھا اور کہاں چلا آیا تھا۔ بس جب بے خودی کا نشہ ٹوٹا تو شاز کا گھر سامنے تھا۔

وہ گھر پر نہیں تھی۔ اس کے والد ملے۔ ملازم مجھے ڈرائنگ روم میں ان کے پاس ہی بٹھا گیا تھا۔ مجھے تو وہ خاصے معقول انسان لگے۔ مگر یہ تاثر بھی پہلی نظر کا تھا۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ میں کچھ اپ سیٹ تھا مگر جوں جوں ان کی اور میری گفتگو نے زور پکڑا مجھے احساس ہوا کہ زندگی کے بارے میں ان کا فلسفہ بھی شاز سے بہت مشابہ تھا۔ البتہ ان تمام باتوں کے برعکس وہ شاز سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اسے ایک بلند مقام پر دیکھنا چاہتے تھے۔

"اٹس مائی ڈریم فرزان کہ میں شاز کو ایک ہائی کوالیفائڈ کامیاب لڑکی بناؤں۔ بس اسی وجہ سے میں نے اسے فی الحال سروس سے الگ کروا دیا ہے تاکہ اپنی اسٹڈیز پر توجہ دے سکے۔"

"جی!"

الفاظ جیسے میرے اندر بگولے کی مانند ادھر ادھر چکرا رہے تھے۔ مگر کہنے کے لیے کچھ بچا نہیں تھا۔ ناصری صاحب کے کہنے کے مطابق شاز جاب پر نہیں تھی جبکہ وہ یونیورسٹی سے یہ کہہ کر غائب رہتی تھی کہ اس کا فلائیٹ شیڈول بہت سخت ہے۔

میں تحیر میں ڈوبتا ابھرتا جا رہا تھا جبکہ وہ کہہ رہے

تھے۔

"بس بیٹا! میں تو ایک بات میں یقین رکھتا ہوں کہ پہلے پڑھائی پھر دوسرے کام اب شاز کو ہی دیکھ لو۔ میرٹ پر ایڈمیشن لیا ہے اس نے جبکہ میری کتنی ہی سورس تھی کراچی یونیورسٹی میں۔"

وہ بڑے فاخر سے ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھے کہہ رہے تھے۔

"جی ہمارے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ بھی تو آپ کے رشتہ داروں میں سے ہیں۔" میں بمشکل حال میں واپس آیا تھا۔ ذہن میں شاز کی باتیں اس کے جھوٹ گھوم رہے تھے۔

"کون انکسار احمد صاحب۔ ارے نہیں بھئی وہ تو خاصا رنگین مزاج آدمی ہے اس کے تو وہی رشتہ دار جو اس کا "خاص" خیال رکھیں۔"

کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے وہ جس عامیانہ انداز میں کہہ کر ہنسے مجھے لگا وہ مجھ پر ہنس رہے تھے۔

یکدم مجھے ہر طرف سے اپنی جانب طنزیہ نظریں مرکوز محسوس ہونے لگیں۔ کوئی ہنس رہا تھا بہت زور سے اور ان قہقہوں میں عمر کا دکھ بھرا لہجہ ہلکورے لے رہا تھا۔ میرے اندر جیسے دھواں سا بھر گیا۔ میں اٹھا اور بمشکل الوداعی کلمات ادا کر کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل رہا تھا کہ بائیں جانب سے بائیک اسٹارٹ کرتے کرتے نظر گیٹ کے باہر پڑی۔

سیاہ ہونڈا یقیناً ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کی ہی تھی غصے سے رنج، تأسف اور بے بسی کا شدید احساس میرے ادراک کی حدوں کو چھو گیا۔ جس لہراتے انداز سے وہ کار سے باہر نکلی تھی میں ان کی بھی ساری داستان سمجھ گیا۔

ایسی اذیت تو دو دھاری تلوار سے کٹنے کی اذیت تک دل میں گڑنے والے خنجر کی بھی نہیں ہو سکتی تھی جو اس لمحے میں نے محسوس کی تھی۔ میری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور بہت تیزی سے کوئی آتشیں سیال میری رگ رگ میں دوڑنے لگا تھا۔

میں ان دونوں کے قریب سے خطرناک اسپیڈ پر بائیک نکال لے گیا تھا مگر وہ اس لمحے آشنائی کے تمام احساس اس مخمور سیال میں ڈوب آئے تھے جس کا خمار اترنے میں کچھ وقت لگنا تھا۔

محبت یا تو کردار سے ہوتی ہے یا ذات سے۔ شخصیت کی کشش کو محبت نہیں کہا جا سکتا۔ میں بھی شاز کی ظاہری خوب صورتی سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کا اعتماد، اس کا حوصلہ اور اس کے بلند آہنگ انکار نے مجھے اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ مگر مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ پہلی بار اس کے حسن نے ہی اپنی طرف میری توجہ مبذول کرائی تھی۔

مگر اب یہی تمام وصف مجھے اس سے نفرت کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ کہتے ہیں جو نفرت محبت کے رستے دل میں آئے وہ پائیدار نہیں ہوتی۔ ممکن ہے یہ سچ ہو مگر زندگی کے اس "تغیر" نے میرا اپنی پسند اپنے فیصلے اور اپنی خواہش پر سے اعتبار اٹھا دیا تھا۔ لہٰذا میں نے والدین کے کہنے پر سر جھکا دیا کہ اس کے علاوہ دوسری کوئی راہ نہ تھی۔

عمر میرے کندھے تھپکتے ہوئے بہت دل گرفتہ لگ رہا تھا فطری طور پر میرے نقصان کا اسے دکھ تھا اور میں بس خاموش تھا۔

*_*_*

آخری سمسٹر تک میں نے بمشکل وقت کاٹا۔ شاز اب بھی اسی روش سے آ رہی تھی۔ میری منگنی کی سب سے زیادہ مبارکباد کے کریڈٹ کا مطالبہ بھی اس نے ہی کیا تھا۔ مجھ پر تو جیسے بے حسی کی راکھ جم گئی تھی۔ کریدنے پر احساس کی کوئی چنگاری تلاشنا مشکل تھا۔ اسی لیے عمر نے بھی شاز سے کوئی سوال جواب نہ کیا کہ بہرحال اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ تاہم جب فیئر ویل فنکشن ختم ہونے پر ہم باہر نکلے تو شاز نے مجھے روک لیا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ آج کے بعد تم مجھ سے کبھی نہیں ملو گے فرزان! اور ممکن ہے میرا ابھی ایسا ہی رد عمل ہو۔ مگر اتنا ضرور سن لو کہ جیسی زندگی تمہارے سامنے آئی ہے اسے قبول کرنے میں ہی تمہارا فائدہ ہے۔ نوشہ یقیناً تمہارے لیے ایک اچھی لائف پارٹنر ثابت ہوگی کیونکہ وہ تمہارے ماحول سے تعلق

رکھتی ہے، جبکہ میں تمہارے ساتھ کسی طور ایڈجسٹ نہیں کر سکتی تھی اور نہ تم ہی مجھے فالو کرتے۔"

وہ بے حد سنجیدہ اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔ عمر اور میں تو جیسے کسی بھرم کے زور پر بت بن چکے تھے۔ حیرت تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں ششدر رہ گیا بالکل۔

"سو میں نے سوچا کہ راستے الگ ہی رکھا جائے۔ تمہارے جیسا لائف پارٹنر ملنا بہت خوشی کی بات ہے فرزان اور نروشہ بہت لکی ہیں۔ پاپا اور مما کی طلاق کے بعد جو شاذ اس دنیا میں تنہا تھی میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ مختلف اور قطعی مختلف ماحول میں پلنے والے فرزان اور شاذ پھر ایسی ہی ایک اور "شاذ" تخلیق کر کے اپنی اپنی دنیا میں مگن ہو جائیں۔"

اس کی لو دیتی چمکتی آنکھیں اس سے بالکل اجنبی لگ رہی تھیں۔

"اور یوں بھی میرے نزدیک محبت کی یہ تعریف کبھی نہیں رہی کہ شادی کر کے ہی اسے دل میں رکھا جائے۔ مجھے تم اچھے لگے ضرور مگر محبت نہ ہو سکی تم سے۔ شاید اسی لیے تمہارا ری ایکشن بہت سخت ہے۔ اینی وے۔ وش یو۔ گڈ لک خدا کرے ہم پھر کبھی نہ ملیں۔"

کہہ کر وہ رکی نہیں تھی بلکہ تیزی سے نکلتی چلی گئی تھی۔ یہ سب کچھ اس قدر غیر متوقع انداز کی طرح وقوع پذیر ہوا تھا کہ میں اور عمر ایک دوسرے سے بھی کچھ نہ کہہ سکے۔ کوئی تبصرہ نہ کر سکے۔ اور وقت ہماری انگلیاں تھام کر آگے نکل گیا۔

——*

نروشہ کو میری زندگی میں آنا ہی تھا اور یہ یقیناً اس وقت سے طے تھا جب میں اس دنیا میں آیا بھی نہ تھا۔ شاید اسی لیے اس کی اور میری شادی میرے ٹالتے رہنے کے باوجود چار سال بعد ہو ہی گئی۔ اس وقت تک میں ذہنی اور قلبی طور پر اسے قبول کرنے کی ہر ممکن کوشش کر چکا تھا۔ میں اسٹیبلش تھا لہٰذا آغا جان اور اماں جان نے میری ایک نہ سنی۔

ان دنوں عمر کے قہقہے اس کی بے تحاشا خوشیاں دیکھ کر مجھے اکثر ولید کا خیال آجاتا۔ وہ اپنے گھر والوں کے پُر زور اصرار پر اپنی سب سے بڑی خواہش ترک کر چکا تھا جیسے زندگی میں اس موڑ پر کھڑا تھا کہ ایک طرف ماضی صدائیں بلند کر کے اپنی طرف بلاتا تھا تو دوسری طرف مستقبل کا اصرار جاری تھا کہ اسے دیکھوں۔

چچا ہمیشہ اندرونِ سندھ رہے، ان سے میل ملاقات بہت کم رہی تھی۔ شاید اسی وجہ سے مجھے نروشہ سے ملنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا اور اگر ہوا ہو گا تو میں نے اسے اہمیت نہیں دی تھی۔ یہ کوئی ایسی خاص بات بھی نہ تھی کہ راتیں اس کے لیے کالی کی جاتیں۔ مگر نروشہ کو پہلی بار اپنے روبرو پا کر میری بقیہ توقعات بھی دم توڑ گئیں۔

وہ بمشکل اٹھارہ انیس سال کی کومل سی نازک سی لڑکی تھی۔ دلہن کے روپ میں اس کا وجود کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ مگر جس ہم عمر ساتھی کی مجھے توقع اور خواہش تھی جس میچور لائف پارٹنر کا ہیولا میرے تصور کے پردے پر ابھرتا تھا۔ حقیقت میں نروشہ اس سے کہیں دور تھی۔

اس نے ابھی انٹر کا امتحان دیا تھا اور مجھ سے کم از کم نو دس سال چھوٹی تھی۔ جانے اسے میرے مزاج کے بارے میں کیا بتایا گیا تھا کہ وہ اس وقت سخت ہراساں اور نروس لگ رہی تھی۔ میرے اندر کوئی چیز جیسے بہت گہرائی میں جا گری تھی۔ اتنی گہرائی میں کہ اس کی آواز بھی مجھ تک نہ آ سکی۔

یہ نہیں تھا کہ نروشہ حسین نہیں تھی بلکہ شاذ کا حسن اس کے سامنے پانی بھرتا نظر آ رہا تھا وہ بالکل نہ بند کلی تھی اور اس کی معصومیت میں جو خوشبو تھی جو نکہت تھی اسے محسوس کر کے میں خود کو دنیا کا خوش نصیب شخص سمجھ سکتا تھا۔

مگر میں شروع سے ہی کچھ انفرادیت پسند رہا ہوں۔ ہمارے خاندان میں بیویاں زر خرید لونڈیوں کی طرح بیاہ کر لائی جاتی تھیں اور پھر ان کے ساتھ وہی سلوک ہوتا جیسا کہ مرد چاہتا۔ ان کی ذاتی پسند ناپسند خوشی غم اور دکھ تکلیف سے شوہروں کو کوئی غرض و غایت نہ

ہوتی تھی۔ یہی حال میرے گھر میں اماں جان بھابھیوں اور اپنی سسرالیوں میں میری بہنوں کا تھا۔ مرد کی حیثیت مسلم تھی۔ لہٰذا بیٹا ہونے کے ناتے میرے سارے ارمان ساری خوشیاں پوری کی گئی تھیں بلکہ مگر شادی بیاہ کا معاملہ اس سے جدا تھا۔ تاہم میرے لیے کم عمر لڑکی کا انتخاب اس لیے کیا جا رہا تھا۔ کیونکہ میں اور سب سے بہت "مختلف" تھا (یہ بات وہ جان گئے تھے جبکہ میں ان کی معلومات سے بے خبر لاعلم تھا) لہٰذا اب کی سوچ کے مطابق نروشہ کو اپنے لیے ڈھالنا میرے لیے آسان ہوتا جبکہ میں اسے پا کر جیسے سارے ارمان نارسائی کی آگ میں جھونک بیٹھا تھا۔

اس رات میں نے بمشکل خود کو اس سے بات کرنے کے لیے آمادہ کیا اور جب پہلا سوال یہ کیا کہ وہ مجھ سے کیا توقع رکھتی ہے کہ میں اسے کتنا خوش رکھوں گا تو اس کا جواب مجھے یوں جھنجوڑ گیا جیسے تپتے ہوئے توے پر کسی نے بہت سا پانی ڈال دیا ہو۔ ننھے ننھے قطرے چھنچھنا اٹھے تھے۔ اس نے کہا تھا۔

"مجھے آپ سے توقع رکھنے کے لیے نہیں لایا گیا۔ توقعات تو آپ کی پوری کرنی ہیں مجھے۔ آپ جو بھی کہیں گے میں کروں گی۔"

لرزتے لہجے اور کپکپاتے انداز میں اس نے یوں کہا تھا جیسے اس کے سامنے میں نہیں کوئی جلاد کھڑا ہو۔

"اُف۔" میری مٹھیاں بھنچ سی گئیں۔ زندگی گزاری جا سکتی تھی اس طرح۔

میرے رد عمل پر وہ بہت پریشان ہو اٹھی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ فاصلے پر ہو گئی تھی۔ جانے اسے مجھ سے اتنا خوف کیوں محسوس ہو رہا تھا۔ رویہ مجھے شروع سے ناپسند تھا وہی ——— مجھ پر محسن کی طرح مسلط کر دیا گیا تھا۔ مجھے شوہر بیوی کے درمیان دوستی برابری اور اعتماد پسند تھا اسی وجہ سے میں نے شاذ جیسی بولڈ لڑکی پسند کی تھی۔ مگر یہاں نروشہ۔

"پلیز لائٹ آف کر دو نروشہ! مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔"

کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر چلا اٹھا تھا وہ اٹھی اور تیزی سے بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے کنگنوں کی کھنک اور پازیبوں کی جھنکار کچھ بھی مجھے متوجہ نہ کر سکی۔

دوسرے روز ولیمے والے دن وہ بالکل شل ہوئی وحشت زدہ تھی اتنی کہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہ پا رہی تھی۔ عمر نے محسوس کر لیا تھا۔ فوراً مجھے ٹوکا بھی۔

"خیریت ایسا کیا کہہ دیا ہے بھابھی کو بالکل ہی رنگ اڑ گیا ہے ان کا۔ بھائی! رحم کرو ان پر بہت معصوم اور سادہ سی لڑکی لگی ہے تمہاری لائف پارٹنر مجھے۔ انہیں شاذ مت سمجھنا۔"

عمر کے کہنے پر میں نے غور کیا۔ وہ بالکل رو دینے کو تھی اور جانے کیوں مجھے اس لمحے اس پر بے اختیار ترس آ گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں اگلے چند دنوں میں میں اس کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہو گیا تھا تاہم وہ اب بھی میری ذرا سی خفگی پر اس قدر ہراساں ہو جاتی کہ میں شرمندہ ہو جاتا۔

——*

میں طبیعتاً جیسا بھی ہوں۔ کم از کم جلاد صفت نہیں ہوں۔ مجھے انسانوں کی انسانوں کے سامنے بہت جھکے سر اور خمیدہ گردن کے ساتھ کھڑے ہونا کبھی نہیں بھایا۔ مؤدبانہ طرز اور غلامانہ انداز میں ایک واضح فرق ہوتا ہے اور میں اس فرق کو محسوس کر سکتا تھا۔ میری تمام تر احتیاط کے باوجود نروشہ مجھے اپنے سامنے بہت دبی ہوئی ہی نظر آتی تھی جانے کس انداز میں اس کی پرورش کی گئی تھی۔ تاہم اس کی ایک خاصیت مجھے بڑی بھلی لگی تھی۔ وہ یہ کہ وہ کس قدر کم سن نظر آتی تھی اسی قدر گہرا رکھ رکھاؤ میں پختگی تھی اس کے۔ میری بات پر وہ اکثر خاموش ہی رہتی مگر جب بولتی تو لاجواب ہونے کے ساتھ ساتھ میں متعجب بھی ہو جاتا۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک سلجھا ہوا صاف ستھرا اور خوب صورت ذہن رکھتی ہے۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود میرے لیے شاذ کو بھلانا آسان نہ تھا۔ چار سال کے اس وقفے میں میں صرف اسی قدر اسے بھلا سکا کہ اس کی شخصیت کے منفی اوصاف ذہن سے کھرچ ڈالے تھے۔ مگر وہ جو جذبوں کا جہاں آباد تھا دل میں اسے اپنی بنیاد سے اجاڑ دینا میرے

لیے فی الحال ممکن نہیں رہا تھا۔ بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ موجودہ شریک حیات بھی میرے آئیڈیل سے میل نہیں کھاتی تھی۔

عمر سے میں نے بھی کچھ چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی وہ میرا مسئلہ سمجھتا مجھے اچھے مشورے دیتا صبر اور ضبط کے درس اسے ازبر تھے۔ مگر زندگی کو ڈکٹیٹ کرنا آسان ہے اسے گزارنا از حد مشکل اور میں اس تجربے سے گزر رہا تھا۔

گھر میں میرا رویہ نروشہ سے اس قدر مشفق اور دوستانہ تھا کہ دھیرے دھیرے وہ اپنے خول سے نکلنے لگی۔ وہ جس صنف سے تعلق رکھتی تھی اسے محبت کی موجودگی یا غیر موجودگی کا پتہ لگانے کا فطری وصف ودیعت ہے لہٰذا اسے بہت جلد احساس ہو گیا کہ میرے دل میں واقعی کوئی اور ہے۔ یوں بھی چار سال جس طرح شادی ٹلی تھی اسے اندازہ تو ہونا ہی تھا۔

محبت کے معاملے میں تو ولی تک مجبور رہے ہیں تو پھر میں تو ایک عام انسان تھا۔ باوجود کوشش کے اسے اس کا جائز حق یعنی میری محبت جس کی بلا شرکت غیرے وہ مالک تھی اسے دے نہیں پا رہا تھا البتہ میرا رویہ اس کے ساتھ بہت احترام بھرا اور تردد آمیز ہوتا تھا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس صورت حال سے اماں جان، بھابھی اور میری بہنیں جو کہ اس کی ہی صنف سے متعلق تھیں خوش ہوتیں مگر یہاں حساب الٹ ہی نکلا۔ جلد ہی آغا جان کی وہ نظریں جو میرے شادی پر مجبور ہو جانے کے باعث اکثر طنزیہ اور فاتحانہ انداز میں مجھ پر اٹھتی تھیں اب مستقل سرزنش کا تاثر لیے ہوتیں۔ غالباً اماں جان کو میرا نروشہ کے ساتھ اس طرح کا مساوی رویہ سخت ناپسند تھا اور یہ سب ان کی بریفنگ کا نتیجہ تھا۔

سب کو شکایت تھی کہ میں ہر معاملے میں اس سے صلاح مشورہ کیوں کرتا ہوں اس کی پسند پر اپنی خواہش کیوں نظر انداز کر دیتا ہوں، مزید یہ کہ میں اس کے ساتھ اتنی نرمی کا برتاؤ کس لیے روا رکھنے کا قائل ہوں۔

اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ یہ میرا فلسفہ حیات ہے۔ میں تنگ نظر اور کینہ پرور نہیں ہوں نہ ہی خود کو آقا کہلانا مجھے گوارا ہے۔ مگر یہاں میرے اس رویے کو جسے مذہب نے پسندیدہ قرار دیا ہے۔ سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ نروشہ ان حالات میں کچھ اور سہم گئی تھی ان ہی دنوں میں نے اور غضب کیا کہ اسے اس کی خواہش پر کالج میں ایڈمیشن دلوا دیا۔

در حقیقت مجھے ایک تعلیم یافتہ، باشعور اور سلجھی ہوئی شریک حیات کی ضرورت اور خواہش تھی۔ نروشہ میں سب ہی وصف موجود تھے سوائے ایک خامی کے وہ یہ کہ وہ نروشہ فرزان تھی شاذ و نادر ہی نہیں، عورت ہو یا مرد پہلی محبت پہلے خواب اور پہلے ساتھ کو بھلانا دونوں کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ میں بھی اسی صورتحال کا شکار تھا شاید اسی لیے جلد از جلد نروشہ کو ویسا ہی دیکھنا چاہتا تھا جیسا کہ میرا خواب رہا تھا۔

مگر یہاں مجھے زیادہ الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نروشہ میں تمام خوبیاں تھیں مگر اعتماد نہ تھا وہ گھر والوں کے ناروا سلوک سے بالکل بجھ گئی تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ میں اس کی تعلیم چھڑوا دوں مگر مجھے یہ طرز عمل سخت گراں گزرتا سو میں نے آغا جان سمیت سب گھر والوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ یا تو مجھے میری مرضی اور خواہش کے مطابق نروشہ کے ساتھ جینے دیں نہیں تو میں یہ گھر ہی چھوڑ دوں گا۔

اس تقریر کے نتیجے میں جیسی خون آشام نظریں اور قہر آلود نگاہیں نروشہ پر اٹھیں، وہ بری طرح سہم گئی۔ اس پر مستزاد اماں جان کا یہ کہنا اسے بالکل ہی توڑ گیا کہ۔

"کیسا ہے تو فرزان! ارے شادی سے پہلے تو ایک بے کردار لڑکی کے لیے مرا جا رہا تھا اور آج نروشہ بیگم اتنی عزیز ہو گئیں کہ اس کے لیے گھر والوں سے لڑنے چلا ہے۔"

اماں جان اس خاردار وادی کے دکھ جھیل کر خود بھی ایک سخت گیر متعصب اور متشدد مزاج خاتون بن گئی تھیں۔ بھابھی کے تیور بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ بھیا اور آغا جان میرے فیصلے اور دو ٹوک انداز پر حیران تھے تو

بہنیں خشمگیں نظروں سے نروشہ کو گھور گھور کر میرے غصے کا گراف بڑھا رہی تھیں۔ حتیٰ کہ میں حتمی اور قطعی فیصلہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"او کے آغا جان! آپ لوگوں کی خاموش کھلبلی اور معاندانہ نگاہوں سے میں نے اپنا جواب پا لیا ہے۔ آپ لوگ اگر خاموش بھی ہو گئے تو نروشہ کے لیے عرصہ حیات تنگ کر دیں گے اور میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔ اب یہ لڑکی جیسی بھی ہے میری بیوی ہے۔"

نروشہ کی نمکین پانیوں سے لبالب کٹوراسی آنکھیں مجھ پر لمحہ بھر کے لیے مرکوز ہوئی تھیں۔ مجھے اس کی پلکوں پر شکریے کے ستارے صاف نظر آ رہے تھے۔

"میرے ماضی کی گرد اس پر ڈال کر آپ میرا مستقبل دھندلا نہیں کر سکتے۔"

اس کا ہاتھ تھام کر میں تقریباً اسے کھینچتا ہوا اندر کمرے میں لایا تھا اور پھر وہ بہت روئی پیٹی مگر میں نے اس کی ایک نہیں سنی۔

وہ الگ گھر لے کر رہنے پر راضی نہ تھی۔ خاندان سے کٹ جانے کا خوف جیسے شہ رگ کے قطع ہو جانے کے دھڑکے سے زیادہ تھا۔ وہ شروع سے ایسے ہی ماحول میں رہی تھی مگر میرے دل میں ان فضولیات کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ لہٰذا اسے میرے ساتھ آنا ہی پڑا۔

میں گورنمنٹ سروس میں تھا۔ لہٰذا ایک اچھا گھر اور ضروریات زندگی مہیا کرنا کچھ ایسا مشکل بھی نہ رہا۔ جلد ہی ہم ایڈجسٹ ہو گئے۔ شروع میں تو نروشہ بہت اپ سیٹ رہی مگر پھر دھیرے دھیرے بہلنے لگی۔ کم از کم اس نے ظاہر تو ایسا ہی کیا تھا۔ تاہم میں جانتا تھا کہ وہ دل سے خوش نہیں۔ اسے خاندان بھر میں مجھے اپنا "غلام" بنا لینے کے جرم میں بدنام کر دیا گیا تھا۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس "اعزاز" کو تمغے کی طرح سجا کر سر فخر سے بلند کرتی مگر اسے احساس تھا کہ یہ سب اس کی کاوش نہیں میری طرف سے ایک طرح کا ہرجانہ ہے۔ محبت نہ دینے کا ہرجانہ، اپنے دل میں نہ بسانے کا ہرجانہ اور میں کیا کرتا کہ اس معاملے میں خود سے لڑ لڑ کر تھک چکا تھا۔

*_*_*

کس قدر ٹھیک کہا تھا ولید نے کہ احتیاج پوری ہو جائے تو بھی خواہش سے دامن چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے اور یکطرفہ تمنا ناتمام بن کر زندگی کا سکون اور دل کی خوشی چھین لیتی ہے۔ آج ایک عرصے بعد جا کر میں نے اس کا فلسفہ سمجھا تھا۔

نروشہ نے جس روز بی اے کا آخری پیپر دیا۔ میں بہت خوش تھا تاہم وہ مجھے دیکھ کر ہنستے ہنستے چپ ہو گئی۔ بہت عجیب سی نظریں مجھ پر ٹکاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ایک بات بتائیے فرزان۔ آپ میری کامیابی سے خوش ہوتے ہیں یا اس بات سے کہ آپ نے میرے دل کا ایک اور خواب پورا کر دیا۔"

"تک کور۔ دونوں ہی باتیں ہیں۔ ہم شریک حیات ہیں نروشہ۔ اور ایک دوسرے کی خوشی پر ہمارا حق ہے۔"

میں نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔

"اور محبت پر۔" اس کا برجستہ اور برملا سوال مجھے چونکا گیا۔

"تمہیں کیوں کر یہ احساس ہوا نروشہ کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔"

میرے مدھم لہجے کے ساتھ ساتھ ڈرائیونگ اسپیڈ بھی سست ہو گئی تھی۔ میں نے کئی دن کے بعد لب بھینچے ہوئے پوچھا تو وہ گود میں رکھے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسانے لگی اور پھر یکدم مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے یہ احساس کیوں کر نہ ہوتا فرزان! میں بے عقل سہی مگر بے حس تو نہیں ہوں۔ پھر یہ تو ایک ایسا معاملہ ہے۔ جس میں دل کی گواہی ہی مستند سمجھی جاتی ہے۔"

اس کا لہجہ سلجھا ہوا اور استفسار واضح تھا۔ میں یہ محسوس کیے بنا نہ رہ سکا کہ یہ دو سال پہلے والی دبو سی گھبرائی شرمائی لجائی رہنے والی نروشہ نہیں۔ اب یہ وہ نروشہ ہے جسے میں نے خود تراشا تھا اور یہ اسی تراش

خراش کا نتیجہ تھا کہ مجسمہ آج بولنے لگا تھا اور مجھے "احتساب" کے کٹہرے میں لے آیا تھا۔ وہ اب مجھ سے مطالبے کرنے لگی تھی۔

"میں آپ سے سوال کر رہی ہوں فرزان! کچھ نہیں کہیں گے آپ کیا اتنی بھی اہمیت نہیں میری۔ میں آپ کی شریک حیات ہوں۔ خواہ جیسی بھی ہوں۔ یہی کہا تھا نا آپ نے۔" وہ درد سے چور لہجے میں کہہ رہی تھی۔

اور میں جیسے حیرت سے گنگ ہوا جا رہا تھا۔ میرے الفاظ میخوں کی طرح گڑے ہوئے تھے اس کے اندر اور آنسو رنگ لہو رواں تھے۔

میری پشیمانی پشیمانی کے داغ سے جلنے لگی۔ میں بہت کچھ دے کر بھی اسے تہی دامن ہی پا رہا تھا۔ وہ تو اب بھی خالی ہاتھ لیے کھڑی تھی۔

"نروشہ دیکھو پلیز۔" میں نے بدقت کچھ کہنے کے لیے خود کو آمادہ کیا۔

"نہیں فرزان نہیں۔ اب کوئی سمجھوتا نہیں۔ مجھے میرا حق دے سکتے ہیں تو دیں۔ نہیں تو بتایئے وضاحت کے ساتھ کہ میری کیا حیثیت ہے۔ آپ کی زندگی میں کہاں گنجائش ہے۔ بتایئے پلیز بتایئے۔

معاً" وہ میری بات کاٹ کر جس بے قراری اور استحقاق سے بولی۔ میں کتنے لمحے اسے تحیر سے تکے گیا۔ جبکہ وہ بہتے آنسوؤں اور میری استعجاب میں ڈوبی نظروں سے قطع نظر کیے جا رہی تھی۔ لگتا تھا بہت دن کا رکا ہوا غبار تھا جو آج وہ نکالنے کے درپے تھی۔

"میں نے بہت ضبط کیا۔ ڈھائی سال کم نہیں ہوتے۔ مجھے آپ کی شفقت، ملائمت اور دوستی کی جتنی قدر کرنی تھی کرلی مگر یہ میری احتیاج نہیں۔ میری احتیاج، میری خواہش کچھ اور ہے۔ ایک بیوی کو اپنے شوہر سے گاڑی بنگلہ جیسے روپے کی طلب نہیں ہوتی فرزان۔ وہ کچھ اور چاہتی ہے۔"

آج اس کا انداز تیکھا، تلخ اور جھنجلاہٹ سے بھرا تھا۔ وہ بہت پوزیسو لگ رہی تھی۔ اس وقت میں بھونچکا سا اسے سن رہا تھا اور جب وہ میری مکمل خاموشی سے بالکل ہی مایوس ہو گئی تو بے اختیار ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ جانے کیوں اس لمحے ایک آسودہ سی مسکراہٹ ایک پر طمانیت تبسم میں سے میرے لبوں پر آٹھہرا۔

مجھے اس میں شازہ ناصری کی جھلک دکھائی دی تھی۔ اپنے حق کے لیے ڈٹ جانے والی اعتماد سے اپنے نقصان کی تلافی کے لیے لڑ جانے والی اور اپنی زندگی کی خوشیاں حاصل کرنے کے لیے ہمت سے قدم اٹھانے والی۔

مجھے اس وقت بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح چپ کراؤں۔ اس لیے خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ شاید میں اس کے دل کا غبار نکلنے دینا چاہتا تھا۔ بقیہ تمام وقت میں حیران ہی ہوتا رہا سوچتا رہا کہ اب نروشہ میں کتنی تبدیلی آ چکی ہے اسی اثناء میں گھر آ گیا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا وہ تیزی سے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی اور میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ کسی مناسب وقت پر ہی اس سے بات کروں گا۔

*_*_*

اس دن کے بعد سے نروشہ حد درجے خاموش رہنے لگی تھی۔ مگر میں اسے زیادہ وقت نہیں دے پایا تھا۔ میری چند دن پہلے ہی پروموشن ہوئی تھی اور نئی پوسٹ پر مجھے زیادہ محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ کچھ یہ بھی تھا کہ میں قصداً اسے نظرانداز کر رہا تھا۔

ان ہی دنوں خاندان میں شادیوں کے فنکشنز نکل آئے تو اور بھی مصروفیت ہو گئی۔ آفس سے آ کر میں ہو جاتا اور شام میں الٹتا تو وہ تیار ہونے چل دیتی۔ پہلے مجھے اسے خاندان میں لے جانے کے لیے بہت سمجھانا پڑتا تھا مگر اب وہ خود تیار ہو جاتی تھی۔ اس کی تیاری میں پہلے والی سادگی نہیں رہی تھی وہ انتہائی نفاست اور خوب صورتی سے خود کو سجاتی لیکن میری تعریف پر اس کا چہرہ بجھ جاتا تھا۔ مجھے احساس تھا مگر میں ہمیشہ خاموش رہ جاتا۔ بس اسے بغور دیکھتا رہتا۔ وہ بدلتی جا رہی تھی، بہت تبدیل ہو گئی تھی۔

حتیٰ کہ جس جگہ جاتی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی اور میری طرف سے قطعی لاپروا ہو جاتی۔ یہ اس کا

مکمل تھا میں برا منائے بغیر بس زیر لب مسکرا دیتا اس کی یہ تبدیلی کسی سے چھپی نہیں تھی خصوصاً "اماں جان" نے مجھے سخت سست سنائی تھیں۔

"فرزان! تجھے کیا ہو گیا ہے۔ بیوی کو سر پر چڑھا لیا اتنا کہ وہ کس بے باکی سے بولتی ہے۔ تمہارے بھیا سے کہہ رہی تھی کہ گڑیا کو یونیورسٹی میں پڑھائے۔ بھلا بتاؤ یہ ریت کب سے چل نکلی ہے ہمارے خاندان میں۔"

وہ ناک پر چشمہ جماتے ہوئے انتہائی ناگواری کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے اماں جان وہ اس طرح لڑکی میں اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ وہ لڑکوں کو ہوا یا آسمانی بلا نہیں سمجھتیں بلکہ معاشرے کے سیٹ اپ کو جلد قبول کر لیتی ہیں۔"

میں اس کی حمایت نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ اپنے نقطہ نظر کو واضح کر گیا تھا جس پر اماں جان کا تو واویلا شروع ہو گیا۔ مجھے زن مریدی اور اسے دیدہ ہوائی کے مخصوص طعنے سننے کو ملے جن پر میں انہیں سلام کر کے وہاں سے اٹھ آیا۔ نروشہ نے بھی قریب کھڑے سب سن لیا تھا۔ مگر آج ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر ملال کے رنگ نہیں چھائے بلکہ وہ اعتماد سے چلتی میرے پہلو میں آ رکی۔

"بہت سے لوگ ہماری بات سمجھنے کی قصداً کوشش نہیں کرتے۔ اماں جان کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔"

وہ مجھ پر نظر جمائے گہرے لہجے میں بولی تھی میں اس کا اشارہ سمجھ رہا تھا لہٰذا تبسم لبوں میں دبائے ہوئے ادھر ادھر ہو گیا۔

اس شام میں گھر لوٹا تو وہ لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے بیٹھی مل گئی گود میں کشن رکھے اس کی نظریں بظاہر ٹی وی پر مرکوز تھیں مگر چہرہ گہرے استغراق کا غماز تھا۔

"کیا بات ہے۔ چپ چپ کیوں ہو؟"

میں شاور لے کر خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا ملازمہ نے چائے لا کر دی تو اس کے پاس آ بیٹھا۔ سپ لیتے ہوئے میں نے قصداً اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔

"جب بولنے کے لیے کچھ نہ رہے تو خاموشی ہی بھلی ہوتی ہے۔"

"مگر تم ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہو۔"

اس کے لہجے میں تیرتے شکوے میں نے نظرانداز کرتے ہوئے جس تغافل اور اطمینان سے کہا۔ وہ مجھے بے حد ملامتی اور شاکی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ہنسنے کے لیے کوئی مجرب اور آزمودہ نسخہ ہو تو مجھے بھی بتایئے۔"

لہجے میں تیکھا پن اور ترشی تھی۔ میں مسکرا کر اٹھا اور کمرے سے مشتاق احمد یوسفی کی کتاب اٹھا لایا۔ اور اس کے پاس ڈالتے ہوئے بولا۔

"یہ لو۔ چراغ تلے بہترین نسخہ ہے۔" جواباً اس نے مجھے تاسف سے دیکھا تھا۔

"مجھے ایسی ہنسی ایسی مسکراہٹ کی خواہش نہیں جو کتابوں میں لکھے لطیفوں کی مرہون منت ہو میں کچی ہنسی ہنسنا چاہتی ہوں۔ ایسی ہنسی جو میرے اندر سے ابلے۔ مگر آپ کبھی نہیں سمجھیں گے۔" اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی تیزی سے چھلکنے لگی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جا کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

در حقیقت مجھے اس کا یہ انداز بے حد بھا گیا تھا شاید اسی لیے میں حظ اٹھا رہا تھا۔ وہ پہلے ایسی نہیں تھی مگر مجھے کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اب وہ بالکل ویسی بن گئی تھی جیسا میں نے چاہا تھا۔ میرے آئیڈیل کے بہت قریب آ گئی تھی وہ۔

عمر کو پتا چلا تو اس نے مجھے سخت برا بھلا کہا۔ وہ تو شروع سے نروشہ کا حامی تھا ابھی بھی اسی کی وکالت کرتا رہا۔ اس کے جانے کے بعد اس کا سنایا یہ شعر دماغ میں ادھم مچاتا رہا اور میں مسکراتا رہا۔

اچھا ہے کہ آپس کے بھرم نہ ٹوٹنے پائیں
کبھی بھی دوستوں کو آزما کر کچھ نہیں ملتا

اس روز ہماری ویڈنگ اینورسری تھی۔ صبح صبح کیلنڈر پر نظر پڑی تو میں چونک گیا۔ نروشہ حسب

معمول میری روانگی سے قبل ناشتے کے لوازمات تیار کرنے اور ساتھ ساتھ مجھے تیار ہونے میں مدد دے رہی تھی۔ خدا جانے اسے آج کا دن یاد تھا یا نہیں۔ اس کے چہرے سے اندازہ لگانا مشکل تھا۔ پچھلی دونوں سالگراہوں پر اس نے ہی پہلے وش کیا تھا۔

مجھے یاد تھا پہلی ویڈنگ اینورسری پر اس نے ایک خوب صورت گفٹ کارڈ اور گلاب کی ایک ادھ کھلی کلی میرے سرہانے رکھی تھی۔ دوسرے سال بھی اس کی یہی روٹین رہی مگر اس بار نہ تو گفٹ تھا نہ گلاب نہ کارڈ۔

اصولاً تو مجھے حیران ہونا چاہیے تھا۔ مگر اس کے تیور جو کہ پچھلے کئی مہینوں سے بدلے ہوئے تھے اس کے پیش نظر مجھے کوئی خاص تعجب نہ ہوا۔

پہلے میں نے سوچا اسے وش کروں پھر کچھ خیال آنے پر رک گیا۔ آفس جانے کا موڈ ختم ہو چکا تھا۔ وہ ناشتہ میز پر لگا کر واپس آئی تو میں اس کے پریس کیے کپڑے واپس ہینگ کر رہا تھا۔

"ارے یہ کیا کر رہے ہیں۔ دیر ہو رہی ہے آپ کو۔"

"آج آفس جانے کا موڈ نہیں ہو رہا۔"

اس کے عجلت مچانے پر میں نے اطمینان سے کہا تو ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔ غالباً اسے خیال ہوا کہ میں اسے وش کرنے کے لیے رک گیا ہوں۔

"کیوں؟" بہت امید سے پوچھا تھا اس نے۔

"بس یونہی" "آج سر میں کچھ درد ہو رہا ہے۔"

میں نے قصداً اس کی طرف پشت کر لی تھی اس کے چہرے پر غصے اور بے بسی کے تاثرات البتہ میں نے نوٹ کر لیے تھے۔ اپنی مسکراہٹ روک کر جس وقت میں دوبارہ مڑا وہ کمرے سے جا چکی تھی۔

ناشتہ اس نے میرے ہی ساتھ کیا البتہ اس کا موڈ سخت آف تھا میری ادھر ادھر کی کسی بات کا اس نے جواب دینا گوارہ نہ کیا تھا۔ ناشتے کے فوراً بعد وہ دوپہر کا کھانا بنانے اور دوسرے کاموں کا بہانہ کر کے چلی گئی۔ تو میں ٹی وی کے سامنے آ بیٹھا۔ ایک کے بعد دوسرا چینل بدلتے بدلتے جب میں بالکل ہی بور ہونے لگا تو وہ چلی آئی۔

گیلے بال تولیے سے لپیٹے سبز لان کے سوٹ میں وہ بہت فریش لگ رہی تھی تاہم آنکھوں کی چمک ماند تھی اسے یقیناً میرے رویے نے بے حد پریشان کیا تھا۔

"کیا ہوا مل گئی کاموں سے فراغت۔"

"ہوں۔" میرے دوستانہ لہجے پر بھی اس کا انداز ہنوز تھا۔

"آپ سے ایک بات کرنا تھی۔" مجھے مستقل اپنی جانب متوجہ پا کر وہ پہلے کچھ جزبز ہوئی پھر سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"مجھے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا ہے۔ اجازت چاہیے آپ کی۔"

"یونیورسٹی میں!"

میں اس اچانک فرمائش کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ لہٰذا ابرو اٹھا کر پوچھا۔

"جی کیا آپ نے نہیں پڑھا وہاں۔"

نظریں نیچے کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی در آئی تھی۔ شاید اسے شاز ناصری یاد آ گئی تھی اور یاد تو مجھے بھی بہت کچھ آ گیا تھا مگر میں فوراً سنبھل گیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔" میں ایک لمحے کو چپ ہوا پھر بولا۔ "یہ حالات سے فرار ہے 'تمہارا شوق' یا کچھ اور ہے۔"

بہت عرصے بعد یا شاید پہلی بار میں نے اسے بغیر کسی ملامت کے مخاطب کیا تھا۔ وہ کچھ حیرت سی مجھے دیکھنے لگی پھر گہری سانس بھر کر اعتماد بحال کرتے ہوئے بولی۔

"پتا نہیں میں تو بس اتنا دیکھنا چاہتی ہوں کہ آخر عظمت کا وہ کون سا معیار ہو گا۔ جب آپ مجھے نظر انداز نہیں کریں گے۔ مجھے جھٹلائیں گے نہیں، مجھے تسلیم کریں گے۔"

وہ تو جیسے سارے حساب آج بے باق کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

"میرا خیال ہے زوشہ! میں نے ہمیشہ تمہیں اہمیت دی تمہاری حیثیت کو مانا اور تمہیں تسلیم کیا ہے۔" میں اب متردد ہو چلا تھا۔ وہ بہت زیادہ بدگمان لگ رہی تھی۔ میری بات پر استہزائیہ سا مسکرائی۔

"تسلیم کرنے اور قبول کرنے میں فرق ہوتا ہے فرزان! آپ نے مجھے تسلیم تو کیا مگر قبول نہیں اور اگر کیا بھی تو محض دکھاوے کو دنیا کو جتانے کے لیے کہ آپ ایک مکمل شخصیت ہیں گھر ہے، بیوی ہے اور ایک بیوی جسے آپ نے گروم کیا۔ جسے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا جسے اعتماد کے ساتھ جینا بتایا۔ جسے یہ ٹریننگ دی کہ اپنے حق کے لیے لڑو اور جب وہ آپ کے سامنے اپنا حق مانگنے کھڑی ہوئی تو اسے نگاہ بھر کر دیکھنا تک ضروری نہیں سمجھا۔" وہ بولنے پر آئی تو بہار کے بولتی چلی گئی۔ شاید وہ اچھی طرح سوچ کر آئی تھی کہ اسے کیا کہنا ہے۔ اس کا لہجہ بھیگ چلا تھا اور میں لب بھینچے اسے سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"آپ نے ایک مثال قائم کر دی۔ وہ فرسودہ روایات توڑ دیں جنہیں ہر کوئی سینے سے لگائے بڑی شان سے جی رہا ہے۔ مگر کیا آج آپ اپنے آپ کو ان تمام لوگوں سے مختلف سمجھتے ہیں۔ نہیں فرزان! آپ ان جیسے ہی ہیں۔ بیوی کو آزادی تو دی آپ نے مگر محبت نہیں۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو کیوں مجھے اس عالم بے خبری سے نکالا۔ کیوں جانے دیا مجھے کہ میں کیا ہوں کیا حق رکھتی ہوں اور اب جبکہ میں پوری طرح بیدار ہو چکی ہوں تو آپ کی یہ بے خبری یہ تغافل مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ میں آپ سے اب کچھ نہیں مانگ رہی صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ مجھے مزید پڑھنے کی اجازت دے دیں۔ نہیں تو اس ماحول میں میرا دم گھٹ جائے گا۔"

وہ میری توقع کے برخلاف بہت زیادہ تھک چکی تھی اور آر یا پار ہونا چاہتی تھی۔

"مگر میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اس طرح گھر اور میں دونوں ڈسٹرب ہو جائیں گے۔" جواباً میں نے جس سکون سے کہا وہ بری طرح تلملا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"فرزان! آپ بے حد۔"

شدید مایوسی، تأسف اور رنج سے وہ کچھ بول ہی نہ سکی تو مڑ کر تیزی سے باہر جانے لگی کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اس نے رخ پھیر کر مجھے شدید غصے سے دیکھا تھا۔

"بیٹھو یہاں۔ تم سے مجھے بھی تو کچھ کہنا ہے۔"

باوجود کوشش کے میرا چوڑا تبسم لبوں پر پھیل گیا تھا۔ وہ کچھ مشکوک اور کچھ ہراساں ہو گئی تھی۔ یہ التفات یقیناً اس کی سمجھ سے باہر تھا اس کا نرم و نازک ہاتھ میری گرفت میں تھا سو اسے رکنا ہی پڑا۔

"کیا کہوں کہاں سے شروع کروں۔" میں کچھ دیر توقف کے بعد بولا تو وہ مجھے ترچھی نظروں سے دیکھنے لگی اور یکدم ہی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ میں نے اسے ٹوک دیا اور نرمی سے کہنے لگا۔

"او نہوں۔ اب میری باری ہے۔ بہت کہہ لیا تم نے جو کہنا تھا۔ پچھلے چند ماہ سے تم ہی بول رہی ہو۔ کبھی ٹوکا میں نے۔ نہیں نا تو اب تم سنو سچ کہوں تو منگنی سے لے کر شادی تک وہ چار سال بڑی اذیت میں گزرے، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ تمہیں اپنی زندگی میں میں نے مجبوراً شامل کیا تھا۔ صرف گھر والوں کے اصرار پر۔" میں رکا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھ کر نادم سا ہو گیا اور اسے اپنے نزدیک کر لیا۔

"لیکن زوشہ! محبت کے معاملے میں انسان بہت مجبور ہوتا ہے۔ میں بھی تھا۔ شاز ناصری اپنی تمام تر برائیوں کے باوجود میرے دل میں بستی تھی۔ مگر اسے مجھے جدائی کا زخم دینا تھا۔ وہ دے گئی۔ پھر تم آئیں اور یقین کرو کہ کئی دن تک تو میں تمہیں قبول ہی نہیں کر سکا مجھے اعتراف ہے کہ کردار اخلاق سیرت اور حسن سب میں شاز تم سے پیچھے تھی تم ہر جگہ حاوی تھیں مگر تمہاری میری عمر کا فرق اور سب سے بڑھ کر تمہاری سراسیمگی اور بے اعتمادی مجھے بالکل ہی مایوس کر گئی۔ میں نے ایک میچور اور ہم عمر ساتھی کا خواب دیکھا تھا۔ کیا تم یقین کرو گی کہ گھر میں کبھی کسی نے تذکرتاً بھی تمہاری عمر نہیں بتائی تھی اور نہ میں نے

پوچھی۔ "میری باتوں پر وہ بے حد تپکی محسوس کر رہی تھی جب ہی یکدم ہاتھ چھڑا کر اٹھنا چاہا تو میں نے اسے زبردستی کھینچ کر اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔

"پھر یوں ہوا کہ دھیرے دھیرے وقت گزرنے لگا تم نے میری ہر خواہش پوری کی۔ صبر کے ساتھ 'ضبط' کے ساتھ گھر میں چاہتا تھا کہ تم خود کو منوا لو اپنا حق پہچانو نہ ملے تو پھر پوری وفاداری سے زندگی کا ساتھ دو اور تم ایسی ہی بنتی چلی گئیں۔ میں نے کبھی کسی پلاننگ کے تحت تمہیں خود سے فاصلوں پر رکھ کر تمہارے اندر جارحیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی بس یوں سمجھو کہ یہ بس ایسے ہی ہوتا تھا۔"

میں نے ذرا کی ذرا رک کر اسے دیکھا تو وہ آنسوؤں سے لبالب بھرے آنکھوں میں حیرت سموئے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ آج پہلی بار میں اتنا بول رہا تھا۔ ورنہ شروع میں نروشہ کی گھبراہٹ اور بعد میں خفگی سے ایسے مواقع کم ہی آئے تھے۔

"مگر شاز ناصری...!!"

وہ جانے کیا پوچھتی کہ رک کر چپ ہو گئی تو میں اس کے رخساروں پر ڈھلک آنے والے آنسو سمیٹ کر مسکرا دیا۔

"یہ ہمارے معاشرے کا سیٹ اپ ہے نروشہ! کہ مرد کبھی نہ کبھی اپنی بیوی سے اپنے ماضی کی رنگینیاں ضرور ڈسکس کرتا ہے اور داد وصول کرنے کا بھی خواہشمند رہتا ہے۔ مگر میں نے ـــ کبھی تم کو ہرٹ کرنا نہیں چاہا مگر اماں جان نے تمہیں اس امر سے واقف نہ کیا ہوتا تو میں تا عمر اس کا تذکرہ نہ کرتا۔ گو کہ مجھے اس بات پر کوئی پشیمانی نہیں کیونکہ وہ میری زندگی میں تب آئی جب تم نہیں تھیں اور اب اس کا کوئی تعلق نہیں مجھ سے۔ جبکہ تم ـ"

میں یکدم شوخی پر آمادہ ہوا تو وہ سٹپٹا کر مجھے دیکھنے لگی۔

"سچ کہوں تم نے مجھے جیت لیا۔ مجھے بھی میرے دل کو بھی اور ہمت کو بھی۔"

میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وارفتگی سے چہکا اور خلوص سے بولا تو وہ بے اختیار عجوب سی ہنس پڑی۔ مطلع یکدم صاف ہو گیا تھا۔

"تو یقین آیا۔" میں نے تسلی کی خاطر پوچھا۔

"آپ کی بس ایک ہی عادت مجھے ہمیشہ اچھی لگی فرزان کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے اور اب اس وقت بھی بس اسی یقین کے سہارے خوشیوں کی امید کرنے لگی ہوں۔"

پلکیں رخساروں پر بچھائے وہ اپنے مخصوص دھیمے سروں میں گویا ہوئی۔ میرے سر سے جیسے منوں بوجھ اترا تھا۔

"اور میرا ایمان ہے کہ یہ امیدیں بار آور ضرور ہوں گی کہ تم وہ موتی ہو جو مجھے بن مانگے ملا ہے اور موتی کی قیمت اب میں جان گیا ہوں۔"

میں نے اس کے بالوں کی لٹ کھینچی تو وہ بے اختیار ہنستی چلی گئی۔ ویسی ہی ہنسی جیسی وہ چاہتی تھی۔

"تو پھر ہو جائے ہنی مون کا ایک سیشن؟" یکدم اسے یاد آیا تو میں ہنس پڑا اور اس کی پلکیں سہلاتے ہوئے کہہ دیا۔

"بس اب اور نہیں۔ تمہاری عقلمندی کا یہی معیار کافی ہے۔ بیگی! چلو اب اٹھو اور فوراً تیار ہو جاؤ۔" ہنستے ہوئے کہہ کر اسے بھی اٹھا لیا۔ تو وہ سوالیہ ہو گئی۔

"بیچ اپنی اور میری نروشہ۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ ہم دونوں خوش رہیں گے۔" اس کے نم بالوں میں چہرہ چھپاتے ہوئے میں نے کہا تو وہ خوشی سے جھوم ہی اٹھی۔

سمندر کا ساحل اس کی پسندیدہ جگہ تھی لہٰذا ہم وہیں چلے آئے تھے اس روز میں نے اسے بے تحاشا ہنستے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے شاز ناصری کا خیال آ گیا۔

"اونہہ اب نہیں۔ وہ ایک پتھر تھا۔ فرزان اور نروشہ ایک موتی ہے اسے بھول جاؤ۔" دل نے کہا تو میں نروشہ کے پاس چلا آیا۔

بن مانگے موتی ملے مانگے ملے نہ پتھر۔ مگر کبھی کبھی دل کی یہ مانگ اپنا آپ منوانے کے لیے سر پٹختی ہے اور خود کے اندر ہی گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ جیسے شاز ناصری مجھ میں کہیں بکھر کر کھو گئی تھی۔